قرآن سے استفادہ

(سوالات وجوابات)

جوابات از

علمائے قم ونجف

مرتبہ

مجاہد حسین حرؔ

ناشر

معراج کمپنی لاہور

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔

نام کتاب .... قرآن سے استفادہ (سوالات و جوابات)

جوابات از .... علمائے قم و نجف

مرتبہ .... مجاہد حسین حرؔ

پروف ریڈنگ ....

کمپوزنگ .... قائم گرافکس۔ جامعہ علمیہ۔ ڈیفنس فیز ۴

ناشر .... معراج کمپنی لاہور

ہدیہ ....

ملنے کا پتہ

معراج کمپنی

بیسمنٹ میاں مارکیٹ، غزنی سٹریٹ اردو بازار۔ لاہور

03214971214،04237361214

محمد علی بک ایجنسی اسلام آباد

03335234311

عرض ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ محسن ملت سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کی ان صدقاتِ جاریہ میں سے ہے جس سے لوگ تا قیامت استفادہ کرتے رہیں گے اور موصوف کے درجات عالیہ میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ مصباح القرآن ٹرسٹ نے تراجم و تفاسیر قرآن سے کام شروع کیا اور پھر ہر وہ کتاب جس کی ملت کو ضرورت تھی شائع کی انشاء اللہ العزیز شائع کرتی رہے گی۔

موجودہ کتاب "قرآن سے استفادہ" قرآنی معرفت کا ایک سلسلہ ہے۔ قرآن مجید سے شغف رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک مفید تحفہ ہو گی۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب انشاء اللہ آپ کو پسند آئے گی۔

یاد رہے کہ مصباح القرآن نے اپنی تمام کتابیں آپ کے استفادہ کے لئے انٹرنیٹ پر دے دی ہیں۔ ایڈریس ہے:

www.misbahulqurantrust.com

قارئین کرام سے التماس ہے کہ اگر وہ اس کتاب میں کہیں خامی دیکھیں یا کمی محسوس کریں تو ہمیں مطلع ضرور فرمائیں ہم آپ کے شکر گزار ہوں گے۔ ادارہ کے ترقی اور اس کے بانی محسن ملت سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کے درجات کی بلندی کے لئے دعا کے طالب ہیں۔

ادارہ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

فہرست کتاب

کیا خداوند متعال کے نزدیک شنبہ کا دن کاہلی اور بھوک کا احترام، کسب معاش اور اوقات فراغت سے بہرہ مند ہونے سے زیادہ ہے؟ 7
خدا کے امتحان کے لئے فرعون کا عمل وسیلہ قرار پانے کے باوجود فرعون پر کیسے عذاب کیا جائے گا؟ 15
قرآن مجید کے سوروں کی ابتدا میں کیوں، دنیا کی معتبر کتابوں کے مانند، سورہ میں بیان شدہ موضوع کا ایک خلاصہ نہیں ہے؟ 20
عقلی نقطہ نظر سے، خداوند متعال کے غنی ہونے کی صفت کو ثابت کیجئے؟ 23
کیا تمام انفال کی مالکیت کو خداوند متعال اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق جاننے والی سورہ انفال کی پہلی آیت اور غنائم کے صرف پانچویں حصہ کو ان سے متعلق جاننے والی اسی سورہ کی آیت نمبر ۴۱ کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے؟ 25
یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت مریم سلام اللہ علیہا کے لئے بہشت سے غذا اور میوے بھیج دیئے جائیں؟ کیا اہل بہشت بھی دوبارہ دنیا میں آسکتے ہیں؟ 29
قرآن مجید میں کن حیوانات اور حشرات کا نام لیا گیا ہے؟ 35

کیا قرآن مجید اس مطلب کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ زرد فام، سرخ فام، بھورے اور سیاہ فام لوگوں سے سفید فام بہتر ہیں؟ 37

اسلامی روایات کے مطابق روح کی ماہیت کیا ہے اور قرآن مجید میں اس سلسلہ میں کیوں وضاحت نہیں کی گئی ہے؟ 49

اس بات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے کہ قرآن مجید میں دعا کے دوران خود کو دوسروں پر مقدم کرنے کا حکم ہے "علیکم انفسکم" جناب زہرا سلام اللہ علیہا کے ذریعہ اپنی دعاؤں میں دوسروں کو مقدم کرنے کی کس طرح سے توجیح کی جاسکتی ہے؟ 57

"وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا" میں صف کے کیا معنی ہیں؟ 60

قلب سلیم سے کیا مراد ہے؟ 62

امام علیؑ نے پیدائش کے بعد آغوش پیغمبرؐ میں قرآن مجید کی کئی آیات کی تلاوت کی ہے، پیغمبرؐ کی رسالت اور آپؐ کے قرآن مجید کے محتویٰ سے رسالت سے پہلے عدم آگاہی کے ساتھ کیسے قابل جمع ہے؟ 65

قرآن کریم کے کتنے سوروں کے نام انبیائے الٰہی کے نام پر ہیں؟ 69

اب تک کس نے شیطان سے مقابلہ میں کامیابی حاصل کی اور کس طرح؟ 70

آیہ شریفہ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ کیسے رشوت کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہے؟ 75

قرآن مجید کے نظریہ کے مطابق خود آگاہی کے معنی کیا ہیں؟ 79

۱۔ فطری خود آگاہی 80

۲۔ عالمی خود آگاہی 81

۳۔ عرفانی خود آگاہی 82

قرآن مجید کی تفسیر فرات میں سورہ تین کی تفسیر میں ایک حدیث نقل کی گئی ہے، جس کے مطابق "تین" سے مراد امام حسنؑ اور "زیتون" سے مراد امام حسینؑ ہیں۔کیا اصولی طور پر یہ حدیث اوراس کے مانند حدیثیں قابل اعتبار ہیں؟ 85
قرآن مجید میں بروج سے کیا مراد ہے؟ 87
کلی طور پر سورہ بنی اسرائیل کی تعلیمات کیا ہیں؟ 90
وہ کونسا سورہ ہے، جس کے نزول کے وقت ستر ہزار فرشتوں نے اسے وداع کیا ہے؟ 92
الحمدللہ رب العالمین کے بارے میں امام حسن عسکریؑ کی تفسیر کیا ہے؟ 93

کیا خداوند متعال کے نزدیک شنبہ کا دن کاہلی اور بھوک کا احترام، کسب معاش اور اوقات فراغت سے بہرہ مند ہونے سے زیادہ ہے؟

سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۶۵ میں ارشاد ہوتا ہے: تم ان لوگوں کو بھی جانتے ھو جنہوں نے شنبہ کے معاملے میں زیادتی سے کام لیا تو ہم نے حکم دیا کہ اب ذلت کے ساتھ بندر بن جائیں۔ بندر ہونا اس کی سزا ہے جس نے محتاجی کی وجہ سے شنبہ کے دن ماہی گیری کی ہے۔ کیا خداوند متعال کے نزدیک شنبہ کا دن کاہلی اور بھوک کا احترام، کسب معاش اور اوقات فراغت سے بہرہ مند ہونے سے زیادہ ہے جبکہ ان دنوں آج کے مانند چھٹی کے دنوں کے لئے تفریحی وسائل مہیا نہیں تھے؟

مختصر جواب

پہلے جاننا چاہئے کہ بنی اسرائیل کا مسخ ہونا صرف اس لئے نہیں تھا کہ انہوں نے روزی کمانے کے لئے ماہی گیری کی تھی، کیونکہ صرف یہ کام انجام دینا گناہ نہیں تھا اور اس کا نتیجہ مسخ ہونا نہیں تھا، بلکہ اسلام کی منطق میں خدا کے نزدیک یہ کام عبادت ہے۔ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے: جو شخص اپنے خاندان کے لئے روزی کمانے کے لئے کام کرتا ہے

اوراس سلسلہ میں سعی وکوشش کرتا ہے، وہ اس مجاہد کے مانند ہے جو میدان کارزار میں خدا کے لئے جہاد کرتا ہے۔ اس لحاظ سے بیشک ان کے مسخ ہونے کی وجہ ماہی گیری کے علاوہ کچھ اور تھی، اور وہ وہی چیز ہے جس کے بارے میں خداوند متعال اشارہ کرکے فرماتا ہے: ہم نے اس طرح ان کا ایک چیز سے امتحان لیا، جس کی وہ نافرمانی کرتے تھے۔

ہمارے دعویٰ کی تائید کرنے والی ایک اور دلیل یہ ہے کہ زیر بحث آیات میں اس قسم کی ماہی گیری کے لئے اعتدوا (حد سے تجاوز کیا) کی تعبیر استعمال ہوئی ہےاور یعدون (حد سے تجاوز کیا) سے استفادہ کیا گیا ہے اور یہ اس کی دلیل ہے کہ ان کی سزا، نافرمانی، اور حکم الٰہی سے تجاوز کرنے اور امتحان الٰہی میں پاس نہ ہونے کی وجہ سے تھی۔

شنبہ کے دن کام نہ کرنا، یہودی قوم کا ناقابل تغیر اصول ہے کہ آج بھی یہودی اس اصول کے معتقد ہیں۔ اس کے معنی کاہلی اور بالکل کام نہ کرنا اور محض آرام کرنا نہیں ہے، بلکہ چونکہ انسان ہفتے کے دوران (ایک دن چھٹی کے علاوہ) زیادہ تر کام کرنے میں مشغول ہوتے ہیں اور عبادت، صفائی، اور خاندان کی طرف کم تر توجہ کرتے ہیں، اس لحاظ سے مناسب ہے کہ ہفتہ میں ایک دن چھٹی کی جائے اور ہفتہ کے دوران توجہ نہ پائے کاموں کی طرف توجہ کی جائے اور وہ دن اپنے خاندان کے ساتھ نشاط وشادمانی سے گزاریں تا کہ ہفتے کا آغاز مثبت انرجی سے کریں۔ پس چھٹیوں کے دنوں (باضابطہ) کام نہ کرنا کاہلی کے معنی میں نہیں ہے۔

تفصیلی جواب

بحث کو واضح کرنے کے لئے مندرجہ ذیل چند نکات کو بیان کرنا ضروری ہے:

ا۔ اصحاب سبت کے بارے میں سوال کے سلسلے میں بیان کی گئی آیہ شریفہ کے علاوہ سورہ اعراف کی آیت نمبر ۱۶۲ میں بھی خداوند متعال نے اس قضیہ کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے ارشاد فرمایا ہے: اور ان سے اس قریہ کے بارے میں پوچھو جو سمندر کے کنارے تھا اور جس کے باشندے شنبہ کے بارے میں زیادتی سے کام لیتے تھے کہ ان کی مچھلیاں شنبہ کے دن سطح آب تک آجاتی تھیں اور دوسرے دن نہیں آتی تھیں تو انہوں نے حیلہ گیری کرنا شروع کردی۔ ہم اس طرح ان کا امتحان لیتے تھے کہ یہ لوگ فسق اور نافرمانی سے کام لے رہے تھے۔

۲۔ چونکہ وہ شنبہ کے دن شکار کرتے تھے یا مچھلیوں کو بند کرتے تھے اور اتوار کے دن پکڑتے تھے، یہاں پر دو قول پائے جاتے ہیں:

اول: مچھلیوں نے شنبہ کے دن کو اپنے لئے امن کا دن جانا تھا اور اس دن زیادہ جمع ہوتی تھیں۔ یہودی انہیں شنبہ کے دن پانی میں بند کرتے تھے اور اتوار کے دن پکڑتے تھے۔

دوم: وہ باضابطہ طور پر شنبہ کے دن شکار کرتے تھے اور اس کام کو حلال سمجھتے تھے۔[1]

۳۔ یہودی خدا اور اس کے رسول کی خیانت کرنے کی وجہ سے اور اپنے دین کی نافرمانی کرنے کے سبب اجتماعی طور پر خدا کی لعنت سے دوچار ہوئے، اس کے نتیجہ میں ان سے ایمان کی توفیق سلب ہوئی، صرف ان میں سے ایک چھوٹی تعداد کے افراد بچ گئے اور خداوند متعال نے ان کو دھمکایا کہ اگر وہ تکبر کریں گے اور بلاعذر نافرمانی کریں گے تو وہ ایسی سختیوں سے دوچار ہوجائیں گے، جو لعنت ہے اور یا ایسے عذاب سے دوچار ہوجائیں گے کہ ان کا نام و نشان باقی نہیں رہے گا یا اس کی لعنت و عذاب سے دوچار ہوں گے، بیشک وہ انہیں نہیں چھوڑے گا۔[2]

یہ مقدمہ بیان کرنے کے بعد ضروری ہے کہ ہم خود سوال پر بحث کریں۔ چونکہ

سوال کچھ ایسے مفروضوں پر مبنی ہے جو صحیح نہیں ہیں، اس لئے ہم اس کا صحیح تجزیہ کرکے اسی ترتیب سے اس کا جواب بھی دیں گے:

کیا ان کے بندر ہونے کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ضرورت کے پیش نظر مچھلیاں پکڑی تھیں؟

اسلامی روایتوں میں بھی اس واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور یہ واقعہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت سے متعلق ہے۔ یہ لوگ سمندر (بظاہر بحر احمر تھا اور یہ لوگ فلسطین کے ساحل پر تھے) کے کنارے ایلہ نامی بندرگاہ (کہ آج بندر ایلات کے نام سے مشہور ہے) پر زندگی بسر کرتے تھے اور خدا کی طرف سے امتحان کے عنوان سے ایک حکم دیا گیا اور وہ حکم یہ تھا کہ مچھلیوں کا شکار چھٹی کے دن کریں، لیکن انہوں نے اس حکم کی نافرمانی کی اور دردناک عذاب سے دوچار ہوئے۔[3] اس بنا پر ان کا مسخ ہونا صرف اس لئے نہیں تھا کہ وہ روزی کمانے کے لئے ماہی گیری کے مرتکب ہوئے تھے، کیونکہ یہ کام نہ صرف گناہ نہیں تھا بلکہ اس کے نتائج مسخ ہونا بھی نہیں تھے، اسلام کی منطق میں یہ کام خداوند متعال کے نزدیک عبادات میں شمار ہوتا ہے۔ ہم یہاں پر اس سلسلہ میں دو روایتیں بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

۱۔ امیر المومنین حضرت علیؑ نے فرمایا ہے: اگر کوئی شخص اپنے عیال کے لئے ایک درہم کا گوشت خرید لے تو وہ اس شخص کے مانند ہے جس نے اسماعیلؑ کی اولاد میں سے ایک بندہ کو آزاد کیا ہے۔[4]

۲۔ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: جو شخص اپنے خاندان کے لئے روزی کمانے کا، کام کرتا ہے اور اس سلسلہ میں سعی و کوشش کرتا ہے، وہ اس مجاہد کے مانند ہے جو میدان کارزار میں خدا کے لئے جہاد کرتا ہے۔[5]

اس لحاظ سے کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے کہ ان کے مسخ ہونے کی وجہ ماہی گیری کے علاوہ کچھ اور ہی تھی اور وہ وہی چیز ہے، جس کی طرف خداوند متعال نے اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: ہم نے اس طرح ایک چیز سے امتحان لیا، جس کی وہ نا فرمانی کرتے تھے[6] اس بنا پر اس سے متعلق آیات و روایات میں گہرائی کے ساتھ توجہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ، حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں ان کے بیٹے حضرت اسماعیل کے ذبح کرنے [7] اور طالوت[8] کے لشکر کو پانی پینے سے منع کئے جانے کے قضیہ کے مانند ہے۔ لیکن اس ہٹ دھرم، لالچی، عناد رکھنے والی اور دنیا پرست قوم نے شیطان اور نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہوئے خدا کے احکام کی نافرمانی کی اور نتیجہ کے طور پر خشم و غضب الٰہی سے دو چار ہوئی اور بندر کی شکل میں مسخ ہوئی۔ ہمارے اس دعویٰ کی تائید کرنے والی ایک اور دلیل یہ ہے کہ زیر بحث آیہ شریفہ میں اس قوم کی ماہی گیری کے لئے اعتدوا (حد سے تجاوز کیا)[9] کی تعبیر استعمال ہوئی ہے اور یعدون (حد سے تجاوز کیا)[10] کی عبارت سے استفادہ کیا گیا ہے اور یہ اس کی دلیل ہے کہ ان کی سزا، نافرمانی اور حکم الٰہی سے تجاوز کرنے اور امتحان الٰہی میں پاس نہ ہونے کی وجہ سے تھی۔

کیا چھٹی کے دن کام نہ کرنا کاہلی کے معنی میں ہے؟

توریت کے مطابق شنبہ کے دن چھٹی کرنا واجب ہے، بلکہ یہودی قوم کا نصب العین اور ناموس شمار ہوتا ہے اور دوسرے واجبات سے اہم تر شمار کیا جاتا ہے، وہ اس سلسلہ میں کہتے ہیں کہ: خداوند متعال نے شنبہ کے دن کائنات کی عمارت کو مکمل کیا اور اس کے بعد آرام فرمایا۔ بنی اسرائیل اس دن باہر آگئے اور مصریوں سے رہائی پائی۔ اس دن یہودیوں کو ہر کام کی چھٹی کرنی چاہئے اور اپنے شعائر قائم کرنے میں لگنا چاہئے۔[11] اس بنا پر شنبہ کے دن کام نہ کرنا یہودی قوم کا پائدار اصول تھا اور آج بھی اس اصول کے معتقد ہیں، اور اس کے

یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اس دن کوئی کام انجام نہ دیں اور صرف آرام کریں، بلکہ چونکہ انسان ہفتے کے دوران (ایک دن چھٹی کے علاوہ) زیادہ تر کام کرنے میں مشغول ہوتے ہیں اور عبادت، صفائی، اور خاندان کی طرف کم تر توجہ کرتے ہیں، اس لحاظ سے مناسب ہے کہ ہفتہ میں ایک دن چھٹی کی جائے اور ہفتہ کے دوران توجہ نہ پائے کاموں کی طرف توجہ کی جائے اور وہ دن اپنے خاندان کے ساتھ نشاط و شادمانی سے گزاریں تاکہ ہفتے کا آغاز مثبت انرجی سے کریں۔ پس چھٹیوں کے دنوں (باضابطہ) کام نہ کرنا کاہلی کے معنی میں نہیں ہے۔

اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہے کہ دین مناسب اور صحیح تفریحات کا مخالف نہیں ہے، بلکہ بعض مواقع پر تفریح کی ہمت افزائی کرتا ہے، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ چھٹی کے دن تفریح سے ہی مخصوص ہوں اور یہودیوں کے لئے بھی ایسا نہیں تھا کہ شنبہ کے دن چھٹی کرکے اس دن کام کاج اور ماہی گیری سے پرہیز کرکے صرف اس دن کی عبادت انجام دیں ۔لیکن انہوں نے اس حکم کی نافرمانی کی۔[12] البتہ ممکن ہے کہ اس سلسلہ میں ایک اور سوال کیا جائے، کہ اس کے پیش نظر کہ بنی اسرائیل شنبہ کے دن بلا واسطہ شکار نہیں کرتے تھے جبکہ شنبہ کے دن انہیں شکار کرنا منع کیا گیا تھا، اس بنا پر انہوں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے، پس وہ کیوں مسخ ہوئے؟

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انہوں نے اس قانون اور حکم الہی کی نافرمانی کی ہے، جبکہ شنبہ کا دن مچھلیوں کے لئے پرامن دن تھا اور وہ اس دن زیادہ جمع ہوتی تھیں اور یہودی انہیں شنبہ کے دن پانی میں بند کرتے تھے اور اتوار کو انہیں پکڑتے تھے (یعنی شرعی حیلہ سے کام لیتے تھے) جبکہ یہ کام، نافرمانی تھا، کیونکہ مچھلیوں کو بند کرنا درحقیقت شکار ہے اور یہ اس کے مانند ہے کہ مچھلی کو پانی سے باہر نکالا جائے اور انہیں کسی تالاب میں ڈال کر پھر انہیں پکڑا جائے۔

نکتہ:

قابل توجہ ہے کہ، توریت، جو پوری بنی اسرائیل کے مناقب پر مشتمل ہے، میں ان تمام واقعات کے مانند اس واقعہ کا ذکرنہیں کیا ہے، جس کی قرآن مجید نے یاد دہانی کی ہے، ان کے بارے میں قرآن مجید کی تعبیرات اورتوریت کی تعبیرات میں بہت فرق ہے۔[13]

حواشی

[1] طبرسی، فضل بن حسن، مجمع البیان فی تفسیر القرآن، گروہ مترجمان، ج1، ص 204 و 205، انتشارات ناصرخسرو، تہران، طبع سوم، 1372 ھ ش.

[2] طباطبائی، سید محمد حسین، المیز ان، موسوی ہمدانی، سید محمد باقر، ج 4، ص 584، دفتر انتشارات اسلامی جامعۃ مدرسین حوزہ علمیہ قم، قم، طبع پنجم، 1374 ھ ش.

[3] مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، ج6، ص 418، دار الکتب الاسلامیۃ، تہران، 1374 ھ ش، طبع اول.

[4] مجلسی، محمد باقر، بحارالأنوار، بحارالأنوار، ج 75، ص 32، مؤسسۃ الوفاء، بیروت۔لبنان، 1404 ھ
.

[5] کلینی، کافی، ج 5، ص 88، دار الکتب الاسلامیۃ، تہران، 1365 ھ ش.

6۔اعراف ۱۶۲

[7] جب اسماعیلؑ کام کرنے کی حد میں پہنچے، ابراہیمؑ نے ان سے کہا: میں نے خواب میں دیکھا کہ تمہیں ذبح کرتا ہوں، اس سلسلہ میں تمہارا نظریہ کیا ہے؟ (جواب میں اسماعیل نے) کہا: ابا جان، جس چیز کی آپ کو ماموریت ملی ہے اسے انجام دیجیے اور انشاءاللہ عنقریب ہی مجھے صابرین میں پائیں گے۔ جب اسماعیلؑ کام کرنے کی حد میں پہنچے، ابراہیمؑ نے ان سے کہا: میں نے خواب میں دیکھا کہ تمہیں ذبح کرتا ہوں، اس سلسلہ میں تمہارا نظریہ کیا ہے؟ (جواب میں اسماعیل نے) کہا: ابا جان، جس چیز کی آپ کو ماموریت ملی ہے اسے انجام دیجیے اور انشاءاللہ عنقریب ہی مجھے صابرین میں پائیں گے۔صافات، 102.

[8] جب طالوت نے اپنے لشکر کے ہمراہ حرکت کی، طالوت نے کہا: خداوند متعال تمہیں ایک ندی سے امتحان لینے والا ہے، پس جو بھی اس ندی سے پانی پیئے گا وہ مجھ سے نہیں ہے، مگر یہ کہ کوئی اس ندی سے

صرف چلو بھر پانی پئے گا، اس کے بعد بعض گنے چنے افراد کے علاوہ سبوں نے اس ندی سے پانی پیا اور جب طالوت اور ایمان لانے والے اس ندی سے گزرے، مخالفت کرنے والوں نے کہا کہ ہم آج جالوت اور اس کے لشکر سے جنگ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ہیں۔ بقرۃ، 249.

[9] قرہ، 65.

[10] اعراف، 163.

[11] طالقانی، سید محمود، پرتوی از قرآن، ج1، ص 186، ناشر: شرکت سہامی انتشار، تہران، 1362ھ ش، طبع چہارم.

[12] مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ (با اندکی تصرف)، ج6، ص 419.

[13] طالقانی، سید محمود، پرتوی از قرآن، ج1، ص 186.

خدا کے امتحان کے لئے فرعون کا عمل وسیلہ قرار پانے کے باوجود فرعون پر کیسے عذاب کیا جائے گا؟

سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۴۹ میں ارشاد ہوتا ہے؛ اور جب ہم نے تم کو فرعون والوں سے بچا لیا جو تمہیں بدترین دکھ دے رہے تھے، تمہارے بچوں کو قتل کر رہے تھے اور عورتوں کو زندہ رکھتے تھے اور اس میں تمہارے لئے بہت بڑا امتحان تھا۔ اس بنا پر فرعون خدا کی طرف سے آزمائش کے لئے مامور تھا، دوسری جانب اس پر کیوں قہر خداوند نازل ہوتا ہے؟

مختصر جواب

خداوند متعال کی ناقابل تغیر سنتوں میں سے ایک بندوں کی آزمائش و امتحان ہے۔
یہ امتحان مختلف و متفاوت اسباب، وسائل اور حوادث کے ذریعہ انجام پاتا ہے، بعض مواقع پر خداوند متعال ظالموں کو دوسرے افراد کے لئے امتحان کا وسیلہ قرار دیتا ہے، ظالم کا امتحان کے لئے وسیلہ قرار پانا اس کی برائی اور عذاب کے مستحق ہونے کو کم نہیں کرتا ہے، کیونکہ خداوند متعال نے اسے حکم نہیں کیا ہے کہ امتحان کا وسیلہ قرار پائے بلکہ تکوینی طور پر ایسے حالات پیدا کئے ہیں کہ اگر ظالم، اپنے اختیار و ارادہ سے کسی ظلم کا مرتکب ہوجائے تو وہی اس کا ظلم جو پروردگار کی مخالفت ہے، دوسروں کی آزمائش کا وسیلہ قرار پاتا ہے اس بنا پر، یہ ظلم چونکہ اس شخص کا اختیاری فعل ہے اس لئے اس کے لئے عذاب ہے اور ظالم اس کا مرتکب ہونے

کے سبب عذاب سے دوچار ہوتا ہے۔

تفصیلی جواب

اس آیہ شریفہ میں خداوند متعال، بنی اسرائیل کو عطا کی گئی بڑی نعمتوں میں سے ایک کی طرف اشارہ فرماتا ہے اور وہ نعمت ظالموں کے پنجے سے آزاد ہونا ہے جو خداوند متعال کی سب سے بڑی نعمتوں میں سے ایک ہے:

اور جب ہم نے تم کو فرعون والوں سے بچالیا جو تمہیں بدترین دکھ دے رہے تھے تمہارے بچوں کو قتل کر رہے تھے اور عورتوں کو زندہ رکھتے تھے اور اس میں تمہارے لئے بہت بڑا امتحان تھا، چونکہ فعل مضارع عام طور پر استمرار و مسلسل کے معنی دیتا ہے اس لئے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل فرعون والوں کی طرف سے مسلسل شکنجہ سے دوچار ہوتے رہے اور اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے تھے کہ اس کے بے گناہ بیٹوں کا سر قلم کرتے تھے اور دوسری جانب، ان کی بیٹیوں کو کنیزوں کے عنوان سے لیتے تھے، اس کے علاوہ خود ان پر بھی شکنجہ کستے تھے اور انہیں قبطیوں اور فرعون والوں کا غلام بنایا جاتا تھا۔

اہم یہ ہے کہ قرآن مجید نے اس قضیہ کو بنی اسرائیل کے لئے ایک سخت اور عظیم امتحان شمار کیا ہے، [بلاء کے ایک معنی امتحان کے ہیں] اور حقیقت میں ان تمام مصیبتوں کو برداشت کرنا ایک سخت امتحان تھا۔[1] لیکن فرعون کا یہ کام اس امتحان الٰہی کے لئے وسیلہ ہونے کے باوجود کیوں اس پر عذاب کیا جائے گا؟

اس سوال کا جواب واضح ہونے کے لئے قابل غور ہے کہ دنیا میں رونما ہونے والے حوادث کے مختلف پہلو ہوتے ہیں ممکن ہے ایک حادثہ ایک شخص کے لئے عذاب ہو اور دوسرے فرد کے لئے امتحان ہو اور خدا کے ہاں تیسرے فرد کے لئے درجہ اور مقام کی بلندی ہو۔ امام علی [ع] نے فرمایا: رونما ہونے والی بلائیں اور حوادث ظالموں کو ادب کرنے کا وسیلہ

اور مومنوں کے لئے امتحان اور ان کا مقام بلند ہونے کا سبب اور اولیائے الٰہی کے لئے کرامت ہیں [2]

دوسری جانب، ناقابل تغیر الٰہی سنتوں میں سے ایک بندوں کا امتحان ہے، قرآن مجید اس سنت الٰہی کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے: کیا لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ صرف اس بات پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ وہ یہ کھہ دیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور ان کا امتحان نہیں ہوگا، بیشک ہم نے ان کے پہلے والوں کا بھی امتحان لیا ہے۔(اور ان کا بھی ضرور امتحان لیں گے][3] یہ امتحان مختلف اور متفاوت اسباب، وسائل اور حوادث کے ذریعہ لیا جاتا ہے، بعض لوگوں کا فقر سے، بعض کا مال و دولت سے، بعض کا بیماری سے، بعض کا صحت وسلامتی سے، بعض کا طاقت سے، بعض کا ضعف و ناتوانی سے، کسی قوم کا سیلاب اور زلزلہ سے، بعض لوگوں کا آرام وآسائش سے، بعض لوگوں کا خیر ونیکی سے اور بعض لوگوں کا شر وغیرہ سے امتحان الٰہی لیا جاتا ہے، قرآن مجید مختلف قسم کے امتحانوں کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے: اور ہم تو اچھائی اور برائی کے ذریعہ تم سب کو آزمائیں گے اور تم سب پلٹا کر ہماری ہی بارگاہ میں لائے جاؤ گے [4]

اس طرح ایک دوسری جگہ پر امتحان کی کیفیت کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:۔۔۔اور اس طرح ہم نے بعض کو بعض کے ذریعہ آزمایا ہے۔۔۔[5] یعنی ہم تم میں سے بعض کا بعض دوسروں کے ذریعہ امتحان لیتے ہیں۔

بعض مواقع پر خداوند متعال نے ظالموں کو دوسرے افراد کے لئے امتحان کا وسیلہ قرار دیا ہے، جبکہ خود ظالم یہ نہیں جانتے ہیں کہ وہ امتحان الٰہی کا وسیلہ قرار پائے ہیں اور ظالم کے امتحان کا وسیلہ قرار پانا اسی کی برائی اور اس کے مستحق عذاب ہونے میں کسی قسم کی کمی کا سبب نہیں بنتا ہے، کیونکہ خداوند متعال نے اسے امتحان کا وسیلہ بننے کا حکم نہیں کیا ہے بلکہ

تکوینی طور پر ایسے حالات فراہم کئے ہیں کہ اگر کوئی ظالم اپنے اختیار و ارادہ سے کسی ظلم کا مرتکب ہوجائے تو، خداوند متعال اس کے اسی ظلم کے ذریعہ دوسرے افراد کا امتحان لیتا ہے، لیکن دوسری جانب، چونکہ یہ ظلم ظالم کا اختیاری فعل ہے اس لئے اس پر عذاب ہوگا اور ظالم پر اس ظلم کے مرتکب ہونے کے لئے عذاب کیا جاتا ہے۔

اس طرح بہت سے مواقع پر خداوند متعال اپنے دین کی ظالموں کے ذریعہ تائید کراتا ہے اور اس کی مدد کرتا ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:: خداوند متعال اس دین [اسلام] کی ان افراد کے ذریعہ مدد کرتا ہے، جو کسی قسم کی لیاقت نہیں رکھتے ہیں [6]

اگر چہ بعض مواقع پر ان ظالم اور کافر افراد کا ظلم دین کی تقویت کا سبب بن جاتا ہے، لیکن ان کو اس کام کے لئے کوئی اجر و ثواب نہیں ملتا ہے۔

اس وضاحت و تشریح کے بعد مذکورہ آیہ شریفہ کے معنی واضح ہوتے ہیں اور معین ہے کہ کسی ظالم کا کام اگر الٰہی امتحان کا وسیلہ بن جائے تو اس کا وہ کام اس کے برے اعمال کی برائی کو زائل کرنے کا سبب نہیں بن سکتا ہے اور اس کے عذاب میں کمی واقع نہیں ہوتی ہے، کیونکہ خداوند متعال نے اسے یہ کام انجام دینے کا حکم نہیں دیا ہے بلکہ اس کا ظالمانہ کام امتحان کا وسیلہ قرار پایا ہے۔

حواشی

[1] مکارم شیرازی ناصر تفسیر نمونہ، ج1، ص: 248 و 429 (با اندکی تصرف)، نشر دار الکتب الاسلامیۃ، تہران، 1374 ش

.[2] وری، مستدرک الوسائل ج 2 ص 438. 2400- 23- جَامِعُ الْأَخْبَارِ، قَالَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ عليه السلام إِنَّ الْبَلَاءَ لِلظَّالِمِ أَدَبٌ وَ لِلْمُؤْمِنِ امْتِحَانٌ وَ لِلْأَنْبِيَاءِ دَرَجَةٌ وَ لِلْأَوْلِيَاءِ كَرَامَةٌ، انتشارات آل البیت، قم 1408 ہ۔ق

[3] .عنکبوت، 2و3: اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ يُّتۡرَكُوۡۤا اَنۡ يَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَهُمۡ لَا يُفۡتَنُوۡنَ ۞

وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ

[4] انبیاء،35: وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۭ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ۝۳۵

[5] انعام،53:: وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ...

[6] کلینی،محمد بن یعقوب، الکافی ج: 5 ص: 19:... اِنَّ اللهَ عَزَّ وَ جَلَّ يَنْصُرُ هَذَا الدِّينَ بِأَقْوَامٍ لَا خَلَاقَ لَهُمْ ...نشر دار الکتب الاسلامیۃ، تہران، 1365 ہ۔ش.

قرآن مجید کے سوروں کی ابتدا میں کیوں، دنیا کی معتبر کتابوں کے مانند، سورہ میں بیان شدہ موضوع کا ایک خلاصہ نہیں ہے؟

دنیا کے تمام معتبر متن میں جب کسی مطلب کو بیان کرنا چاہتے ہیں، تو اس کی ابتدا میں اس مطلب کا ایک خلاصہ بیان کیا جاتا ہے اور اس کے ذریعہ قارئین کو اصل مطلب سے مطلع کیا جاتا ہے، اس کے بعد موضوع کے بارے میں تفصیلی بحث کی جاتی ہے۔ کیا یہ مطلب قرآن مجید کے تمام سوروں پر صادق آتا ہے یا یہ کہ ہر سورہ کا مطلب بکھرا ہوا ہے اور ان مطالب کا آپس میں کوئی خاص رابطہ نہیں ہے؟ (البتہ متوسط اور بڑے سوروں کے بارے میں نہ کہ چھوٹے سوروں کے بارے میں)

مختصر جواب

ایک متن کے اعتبار کو صرف اس کی ابتدا میں خلاصہ سے ہی موازنہ نہیں کرنا چاہئے اگر چہ اس طریقہ کار کو بعض علمی تحقیقات کے لئے مناسب جانا جاسکتا ہے۔ لیکن ہم اس وقت بھی مشاہدہ کررہے ہیں کہ مسلمانوں کے بہت سے معتبر دینی دائرۃ المعارف، گوناگوں مسائل کو ایک خاص مقصد کے پیش نظر پیش کرتے ہیں، اکثر موارد میں اس روش سے استفادہ نہیں

کیا جاسکتا ہے اوراس سے ان کے اعتبار کو کوئی خدشہ نہیں پہنچتا ہے۔

قرآن مجید بھی مسلمانوں کا سب سے اہم دینی دائرۃ المعارف ہے اور گوناگوں مسائل کو ایک مقصد کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے اکثر مواقع پر اس روش سے استفادہ نہیں کیا جاتا ہے کیونکہ اس قسم کا خلاصہ پیش کرنا سورہ میں موجود مطالب کو بہتر صورت میں ادراک کرنے میں کوئی خاص اثر نہیں رکھتا ہے۔

تفصیلی جواب

جواب کی ابتدا میں ہم عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اگر چہ ضخیم جزئی مسائل کے بارے میں تحقیق کی روش یہی ہے جو آپ نے اپنے سوال میں بیان کی ہے اور اکثر تھیسز اور علمی مقالے بھی ایک روش میں تدوین ہوتے ہیں لیکن اس موضوع سے ایک کلی نتیجہ حاصل نہیں کیا جاسکتا ہے کہ دنیا کا ہر معتبر متن اس روش کے مطابق ہونا چاہئے اور اگر ایسا نہ ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

اس قسم کے متن کے قابل اعتبار نہ ہونے کی صورت میں ہمیں قبول کرنا چاہیئے کہ اکثر قدیمی دانشوروں کی کتابیں اور تحقیقات اس روش سے استفادہ نہیں کرتے تھے اور اس کے علاوہ جن کتابوں میں کلی موضوعات پیش کئے جاتے ہیں ان کے لئے خلاصہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی ایسا نہیں ہے کہ اس قسم کی کتابیں قابل استناد اور معتبر نہ ہوں بیشک آپ بھی اس قسم کے نظریہ کو قبول نہیں کریں گے۔

اس بنا پر، کسی متن کے اعتبار کو اس کی ابتدا میں خلاصہ لکھنے کی شرط سے مخصوص نہیں کیا جاسکتا ہے اور اصولی طور پر متن کے لئے خلاصہ نویسی کی روش پیش کرنا صرف ان تالیفات سے متعلق جانا جاسکتا ہے جن میں شرح وتفسیر زیادہ ہو اور مطالب مکرر لکھے گئے ہوں اور ان میں کافی جزئیات پائے جاتے ہوں قدرتی بات ہے کہ جو شخص اس قسم کی تالیفات کا

مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اگر اس کی ابتدا میں مولف کا مقصد ایک خلاصہ میں بیان کیا گیا ہو تو اس کا تجزیہ و تحلیل آسانی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے لیکن جن تالیفات کی ابتدا میں خلاصہ بیان کرنے سے اس کے کلی مطالب کو سمجھنے میں کوئی مدد نہ ملے تو اس صورت میں ایسا لگتا ہے کہ اس قسم کا خلاصہ نہ صرف اس کے اعتبار کا سبب بن سکتا ہے بلکہ یہ ایک اضافی تحریر ہوگی کہ جس کا مطالعہ کرنے والے کا وقت ضائع کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا فائدہ نہیں ہوگا اور اس بنا پر ایسے دائرۃ المعارف جن میں متن درج ہوتے ہیں، عام طور پر ان کی ہر فصل کی ابتدا میں کوئی خلاصہ پیش نہیں کیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود اس میں موجود مطالب قابل اعتبار ہوتے ہیں۔

اس سلسلہ میں، جاننا چاہیے کہ قرآن مجید کے سورے حقیقت میں ایسے دائرۃ المعارف ہیں جن میں گوناگوں مطالب درج ہیں جن کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے اکثر موارد میں سورہ کی ابتدا میں اس کا خلاصہ بیان کرنا آیات کو بہتر صورت میں سمجھنے میں کوئی مدد نہیں کرسکتا ہے البتہ بعض موارد جن کے لئے خلاصہ بیان کرنا پڑھنے والے کو پروردگار کے مقاصد کو سمجھنے میں مدد کرسکتا ہے وہاں پر اس قسم کا خلاصہ موجود ہے مثال کے طور پر سورہ یوسف کہ جس کی ابتدا میں اس پیغمبر الٰہی اور اس کے بھائیوں کی داستان کو خلاصہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ ان حوادث میں پروردگار کی قدرت کی بکثرت نشانیاں پائی جاتی ہیں [1] اور اس طرح اس داستان کی نسبت مفصل تشریح پیش کرنے کے سلسلہ میں خداوند متعال کا اصلی مقصد اعلان کیا گیا ہے اور یہ کہ یہ سورہ صرف داستان سرائی نہیں کرتا ہے، اس کے بعد سورہ کے اختتام تک ان الٰہی نشانیوں کو ایک ایک کرے بیان کیا گیا ہے۔

حواشی

[1] یوسف ۷۔لقد کان فی یوسف واخویہ آیات للسائلین۔

عقلی نقطہ نظر سے، خداوند متعال کے غنی ہونے کی صفت کوثابت کیجئے؟

جواب

خداوند متعال قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے: انسانو، تم سب اللہ کی بارگاہ کے فقیر ہواور اللہ صاحب دولت (بے نیاز وغنی) اورقابل حمد وثنا ہے۔[1]

خداوند متعال کے غنی اور بے نیاز ہونے کی صفت، خداوند متعال کی صفات ثبوتیہ میں سے ہے۔ خداوند متعال کی صفات کوثابت کرنا عام طور پر خداوند متعال کے وجود کوثابت کرنے کے بعد ممکن ہے۔ غنی اور بے نیازی کی صفت بھی خدا کے وجود اور وحدانیت اور بے علت ہونے کوثابت کرنے کے بعد ممکن ہے۔ ہم یہاں پر صرف وجوب وامکان کی برہان کو بیان کریں گے، جو پروردگار کی علت کے سلسلہ میں عدم احتیاج ہے اور یہ بے نیاز ہونا ہے۔

وجوب وامکان کی برہان (فقر وغنی)۔[2]

جن مخلوقات کا ہم اس کائنات میں مشاہدہ کررہے ہیں، وہ سب ایک دن معدوم تھیں، اور اس کے بعد انہوں نے وجود کا لباس زیب تن کیا ہے، یا دقیق تر الفاظ میں ایک دن کچھ نہیں تھیں اور اس کے بعد وجود میں آ گئی ہیں، اور یہ اس کی دلیل ہے کہ تمام مخلوقات کسی دوسرے وجود کی

معلول ہیں اور اپنی طرف سے ہستی کی مالک نہیں ہیں۔ اور ہم بخوبی جانتے ہیں

کہ ہر ایک معلول وابستہ اور اپنی علت پر قائم ہوتا ہے اور سراپا نیازمند اور محتاج ہے۔ اور اگر یہ علت بھی کسی دوسری علت کی معلول ہو تو اپنی حیثیت سے محتاج اور نیازمند ہوگی، اور اگر یہ امر لامتناہی حد تک تسلسل پیدا کرے تو مخلوقات کا ایک مجموعہ محتاج اور فقیر ہوگا، مسلم ہے کہ اس قسم کا مجموعہ ہرگز موجود نہیں ہوگا، کیونکہ انتہائی محتاجی، نیازمندی ہے اور انتہائی فقرہ فقر ہے۔ بے انتہا صفر سے کوئی عدد حاصل نہیں ہوتا ہے اور بے انتہا وابستگی سے کوئی آزادی حاصل نہیں ہوتی ہے۔

اس سے ہم نتیجہ حاصل کرتے ہیں کہ بالآخر ہمیں ایک ایسے وجود تک پہنچنا چاہیئے جو اپنی ذات پر قائم ہے لیکن معلول نہیں ہے اور وہ واجب الوجود ہے۔ اس قسم کا وجود، جو علت مطلق ہے، سب سے بے نیاز ہے اور دوسری تمام مخلوقات اسی کے وجود سے موجود ہیں اور اسی کی محتاج ہیں۔[3]

اس محتاجی کو اس لئے بیان کیا گیا ہے، کہ خداوند متعال تمام مخلوقات کا مبداء اور تمام کمالات بخشنے والا ہے، پس خود اس کے پاس ہر وہ چیز ہونی چاہیئے، جس کی دوسری مخلوقات محتاج ہیں، کیونکہ جو کوئی چیز عطا کرتا ہے، ہو نہیں سکتا کہ وہ چیز اس کے پاس نہ ہو۔ پس وہ مطلق غنی اور بے نیاز ہے، کیونکہ اگر وہ ایک لحاظ سے غنی اور ایک لحاظ سے محتاج ہو، تو اس جہت سے کمال عطا کرنے والا نہیں ہوسکتا ہے، اور یہ فرض کے خلاف ہے۔ کیونکہ ہم نے کہا کہ وہ ہر کمال کو عطا کرنے والا ہے۔[4]

حواشی

[1]۔ فاطر، ۱۵ [2]۔ مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، ج ۱۸، ص ۲۲۔

[3]۔ ملاحظہ ہو: سائٹ اندیشہ قم۔

[4]۔ طباطبائی، محمد حسین، ترجمہ المیزان، ج ۱۶، ص ۳۴۶۔

کیا تمام انفال کی مالکیت کو خداوند متعال اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق جاننے والی سورہ انفال کی پہلی آیت اور غنائم کے صرف پانچویں حصہ کو ان سے متعلق جاننے والی اسی سورہ کی آیت نمبر ۴۱ کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے؟

سورہ انفال کی پہلی آیت، بلا استثنا تمام انفال کو خداوند متعال اور اس کے رسول (ص) سے متعلق جانتی ہے، لیکن اسی سورہ کی آیت نمبر ۴۱ غنائم کے صرف پانچویں حصہ کو ان سے متعلق جانتی ہے اور قدرتی طور پر اس کے باقی چار حصے جنگ لڑنے والوں سے متعلق ہوں گے۔ آپ کی نظر میں ان دو متعارض آیات میں سے کونسی آیت صحیح ہے؟

مختصر جواب

غنائم اور انفال، منطقی لحاظ سے یکساں نہیں ہیں، لیکن اس کے باوجود قابل ذکر ہے کہ وحدت کے نظریہ کے مطابق تمام انسانوں اور پوری عالم ہستی کو پروردگار سے متعلق جانا جا سکتا ہے، لیکن کثرت کے نظریہ کے مطابق بعض مادی نعمتیں، خدا سے تعلق منقطع ہوئے بغیر،

بظاہر انسان کی مالکیت میں قرار پائی ہیں اور ان دو کا آپس میں کوئی تعارض اور منافات نہیں ہے۔

تفصیلی جواب

بظاہر تعارض رکھنے والی آیات حسب ذیل ہیں:

الف): يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ۭ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ

۔۔۔[1] پیغمبر، یہ لوگ آپ سے انفال کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو آپ کہد یجئے کہ انفال سب اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہیں۔۔۔

ب) وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ

۔۔۔[2] اور جان لو کہ تمہیں جس سے بھی فائدہ حاصل ہو، اس کا پانچواں حصہ اللہ، رسول اور۔۔۔ کے لئے ہے۔۔۔

اس سلسلہ میں کہنا ہے کہ: باوجودیکہ شیعوں کے تفسیری نظریہ کے مطابق انفال اور غنیمت کے درمیان مساوی ہونے کے لحاظ سے کوئی منطقی رابطہ نہیں ہے، پھر بھی مندرجہ ذیل نکتہ بیان کر کے اس قسم کے شک وشبہات کو دور کرنے میں مدد حاصل کی جاسکتی ہے:

پہلی نگاہ میں اور وحدت کے نظریہ کے مطابق، ہمارا پورا وجود اور جو کچھ اس سے استفادہ کرنے کی ہم طاقت رکھتے ہیں، سب ہستی بخشنے والے خداوند متعال سے متعلق ہے۔ اس حقیقت کی قرآن مجید کی متعدد آیات میں مخاطبین کو یاددہانی کرائی گئی ہے، من جملہ:

۱۔ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ ۔[3] جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، وہ پروردگار سے متعلق ہے۔[4]

۲۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ١٥٦ؕ ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور اسی کی بارگاہ میں واپس جانے والے ہیں۔

۳۔ قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ [5] ان سے کہئے کہ زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے وہ سب کس کے لئے ہے؟ پھر بتایئے کہ سب اللہ ہی کے لئے ہے۔۔۔[6]

دوسری جانب، کثرت کے نظریہ کے مطابق، خداوند متعال نے انسانوں کو دنیا میں موجود بعض نعمتوں کا مالک جانا ہے اور مختلف مواقع پر، کلی طور پر یا ایک خاص تقسیم بندی کرکے اس موضوع کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ایک اور جگہ پر یوں اپنی ستائش کرتا ہے: هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ ﴿۱۵﴾ [7] اس نے تمہارے لئے زمین کو نرم بنا دیا ہے کہ اس کے اطراف میں چلو اور رزق خدا تلاش کرو پھر اسی کی طرف قبروں سے اٹھ جانا ہے۔

خمس[8]، وراثت[9] اور مالکیت وغیرہ جیسے مادی امور میں بھی ایسا لگتا ہے کہ پروردگار عالم نے انسانوں کو ایک قسم کی مالکیت بخشی ہے۔ قدرتی بات ہے کہ مذکورہ بظاہر متفاوت دو نظریات کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، اور قرآن مجید نے کیا خوبصورت انداز میں ایک آیہ شریفہ میں ان دونوں نظریات کے بارے میں اشارہ فرمایا ہے: وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾ ؛[10]، اور اس نے تمہارے لئے زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو مسخر کر دیا ہے، بیشک اس میں غور و فکر کرنے والی قوم کے لئے نشانیاں پائی جاتی ہیں۔

مذکورہ نکات اور غنیمت و انفال کے درمیان فرضی اتحاد کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ غنائم کے پانچ حصوں کو جنگ کرنے والوں کو عطا کرنے کا سرچشمہ بھی پروردگار عالم کی بلا شرکت مالکیت ہے اور ان چیزوں کی ظاہری ملکیت ان کی حقیقی ملکیت کو کم نہیں کر سکتی ہے۔

حواشی

[1] انفال، 1.

[2] انفال، 41.

[3] بقرہ، 284؛ آل عمران، 109 و 129؛ نساء، 126 و...

[4] بقرہ، 156.

[5][5] بقرہ، 156.

[6] ملک، 15.

[7] انفال، 41.

[8] نساء، 12-11.

[9] نساء، 12-11.

[10] ز جاثیہ، ۱۳

یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت مریم سلام اللہ علیہا کے لئے بہشت سے غذا اور میوے بھیج دیئے جائیں؟ کیا اہل بہشت بھی دوبارہ دنیا میں آسکتے ہیں؟

۱۔ کیا یہ صحیح ہے کہ حضرت مریم سلام اللہ علیہا کے لئے بہشت سے غذا اور میوے آتے تھے؟

۲۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ بہشت سے اس قسم کی چیزیں زمین پر آئیں؟ کیونکہ خداوندمتعال قرآن مجید میں بیان فرماتا ہے کہ بہشت کی چیزیں ابدی ہیں؟ اب اگر ہم قبول کریں، کہ بہشت کی چیزیں زمین پر آسکتی ہیں، تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اہل بہشت بھی دنیا میں آنے کی طاقت رکھتے ہیں؟

مختصر جواب

آیات و روایات میں پائے جانے والے قرائن و شواہد کے پیش نظر، حضرت مریم سلام اللہ علیہا کی غذا کسی مادی وسیلہ کے بغیر براہ راست بہشت سے آتی تھی۔ جو کچھ اسلامی تعلیمات میں پایا جاتا ہے، وہ بہشت میں انسانوں کی زندگی کا ابدی اور لافانی ہونا اور ان کا مسلسل نعمتوں اور لذتوں کا مالک ہونا ہے کہ وہاں کی نعمتیں قابل تجدید ہوتی ہیں اور اسی وجہ

سے ان کا خاتمہ قابل تصور نہیں ہے۔

لیکن قدرتی بات ہے ہر نعمت سے استفادہ کرنا، اس کا ایک قسم کا خاتمہ شمار ہوتا ہے اور اسے ابدی نہیں جانا جا سکتا ہے، اگرچہ قابل تجدید بھی ہو۔

اس بنا پر، اولاً: حضرت مریم سلام اللہ علیہا کا بہشتی غذا سے استفادہ کرنا، بہشت کی نعمتوں کے ابدی ہونے سے کوئی منافات نہیں رکھتا۔

ثانیاً: ممکن ہے کہ ان کی غذائیں برزخ کی بہشت سے آتی تھیں اور جاننا چاہئے کہ برزخ کی بہشت سے دنیا میں آنا ممکن نہیں ہے، لیکن دنیا کے خاتمہ اور انسانوں کی آخری حالت مشخص ہونے کے بعد دنیا کا وجود ہی نہیں ہوگا کہ اس میں واپس لوٹنا قابل تصور ہو۔

تفصیلی جواب

اس سوال کی کئی حصوں میں تحقیق کی جا سکتی ہے:

اول: کیا جس غذا کا زکریا پیغمبرؑ نے حضرت مریم سلام اللہ علیہا کے پاس مشاہدہ کیا ہے، وہ ان کے لئے بہشت سے لائی جاتی تھی؟

دوم: کیا بہشتی غذا ضروری ہے کہ ابدی ہو یا ممکن ہے کہ دنیا کی دوسری چیزوں کے مانند تغیر و تبدل کے قابل ہو؟

سوم: کیا انسان بہشت سے دوبارہ دنیا میں آسکتے ہیں؟

اب ہم ترتیب سے ان کا جواب دیتے ہیں:

۱۔ سوال کے پہلے حصہ کے بارے میں قابل ذکر ہے کہ: قرآن مجید میں حضرت مریم سلام اللہ علیہا کی غذا کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ: جب زکریاؑ محراب عبادت میں داخل ہوتے تو مریم (س) کے پاس رزق دیکھتے اور پوچھتے کہ یہ کہاں سے آیا؟ اور مریم سلام اللہ علیہا جواب دیتیں یہ سب خدا کی طرف سے ہے، وہ جسے چاہتا ہے رزق بے حساب عطا کر دیتا

ہے۔[1]

لیکن یہ غذا، کس قسم کی غذا تھی اور حضرت مریم سلام اللہ علیہا کے لئے کہاں سے آئی تھی، اس کا آیہ شریفہ میں ذکر نہیں کیا گیا ہے، لیکن احادیث کی کتابوں میں درج کی گئی متعدد روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس الٰہی خاتون کو ملنے والی غذا خلاف موسم پھلوں پر مشتمل تھی، اور وہ پھل خدا کے حکم سے محراب کے پاس پیدا ہوتے تھے[2]۔ اس موضوع میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ خداوندمتعال اپنے پرہیزگار بندے کی اس طرح مہمان نوازی کرے، لیکن (المنار کے مولف کے مانند) بعض مفسرین کا اعتقاد ہے کہ رزقا سے مراد یہی دنیا کی عام غذا ہے، کیونکہ ابن جریر سے نقل کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل قحط سالی سے دوچار ہوئے اور حضرت زکریا حضرت مریم کو پالنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے، اس موقع پر قرعہ اندازی کی گئی اور قرعہ ایک نجار کے نام نکلا اور وہ رضا کارانہ طور پر اپنی آمدنی سے حضرت مریم سلام اللہ علیہا کے لئے غذا مہیا کرتا تھا اور جب حضرت زکریاؑ محراب کے پاس جاتے تو ان مشکل حالات میں اس غذا کو وہاں پر پا کر تعجب سے سوال کرتے تھے اور حضرت مریم سلام اللہ علیہا ان کے سوال کے جواب میں کہتی تھیں: کہ خداوندمتعال نے ان سخت حالات میں ایک باایمان شخص کو یہ خدمت انجام دینے پر مامور کیا ہے۔

یہ تفسیر آیت میں موجود قرائن کے مطابق ہے اور نہ اس سلسلہ میں نقل کی گئی روایتوں سے موافقت رکھتی ہے؛ تفسیر عیاشی میں اس سلسلہ میں امام باقرؑ سے ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ: پیغمبر اسلام (ص) ایک دن حضرت زہراء (س) کے گھر تشریف لائے، کئی دنوں سے حضرت زہراء (س) کے گھر میں کھانا موجود نہ تھا، آنحضرت (ص) نے اچانک حضرت زہراء (س) کے پاس ایک غذا دیکھی اور ان سے پوچھا: یہ غذا کہاں سے آئی ہے؟ فاطمہ (س) نے عرض کی: خدا کی طرف سے ہے، وہ جسے چاہتا ہے بے حساب روزی عطا

کرتا ہے۔ پیغمبر اکرم (ص) نے فرمایا: یہ قضیہ حضرت زکریاؑ کے قضیہ کے مانند ہے، کہ وہ حضرت مریم سلام اللہ علیہا کے پاس محراب میں آئے اور وہاں پر ایک مخصوص غذا کو دیکھ کر ان سے پوچھا: اے مریم؛ یہ غذا کہاں سے آئی ہے اور انہوں نے جواب میں کہا: خدا کی طرف سے ہے[3]۔

البتہ یہ موضوع کہ رزقاً سے مراد بہشتی غذا کا ہونا، اس آیہ شریفہ کے گوشہ و کنار میں پائے جانے والے قرائن سے معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اولاً: لفظ رزقاً کا نکرہ کی صورت میں استعمال ہونا اس کی علامت ہے کہ یہ غذا حضرت زکریاؑ کے لئے ایک خاص اور غیر عادی غذا تھی، ثانیاً: حضرت مریم سلام اللہ علیہا کا جواب کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اس مطلب کی دوسری علامت ہے۔ ثالثاً: آیہ شریفہ کے بعد والے حصہ میں حضرت زکریاؑ کا جذبات سے لبریز ہو کر پروردگار سے ایک اولاد کی درخواست کرنا، اس معنی کے لئے ایک اور قرینہ شمار ہوتا ہے[4]۔

دوسری جانب، علم کلام میں توحید افعال کے باب میں ثابت ہوا ہے کہ خداوند متعال قدرت مطلقہ رکھتا ہے اور تخلیق، رزق، زندہ کرنا، موت دینا، غنی، فقر، عزت، ذلت، تندرستی اور بیماری وغیرہ اسی کی قدرت میں ہے، بالآخر کبھی عادی اسباب (انسان کے اختیاری وغیر اختیاری اسباب) سے استفادہ ہوتا ہے اور کبھی عام اسباب کے بغیر، حضرت آدمؑ وحوا وغیرہ کی تخلیق کے مانند اپنی قدرت سے استفادہ کرتا ہے۔ انبیائے الٰہی کے معجزات بھی اسی قسم کے اور غیر معمولی ہوتے ہیں۔ اسی طرح حضرت مریم سلام اللہ علیہا کی غذا بھی غیر معمولی صورت میں اور اسباب کے بغیر ظاہر ہوئی ہے۔[5]

سوال کے دوسرے حصہ کے بارے میں قابل ذکر ہے کہ: اس وقت مادی دنیا میں یہ قاعدہ قبول کیا گیا ہے کہ مادہ اور انرجی کبھی نابود نہیں ہوتے ہیں، بلکہ ایک دوسرے میں تبدیل ہو کر مختلف صورتوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں، اس دنیا میں استعمال ہونے

والی عام غذا کا ایک حصہ بدن کے اندر انرجی اور مادہ میں تبدیل ہوتا ہے اور باقی بچی غذا فضلہ کی صورت میں انسان کے بدن سے خارج ہوتی ہے، لیکن اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ سسٹم، مواد کی تبدیلی کی تنہا راہ ہو اور کم از کم عقل کے لحاظ سے یہ ناممکن نہیں ہے کہ کوئی اور طریقہ درکار ہو جس میں فضلہ کی صورت میں خارج ہونے والے مواد میں موجود بدبو برطرف کی جائے یا تمام استعمال شدہ مواد انرجی میں تبدیل کیا جائے۔

عالم آخرت کے بارے میں جاننا چاہئے کہ آیات و روایات میں انسان کی بہشتی زندگی کے ابدی اور جاودانی ہونے اور بہشتی نعمتوں اور لذتوں کے دائمی ہونے کے اشارے ملتے ہیں، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو غذائیں بہشتیوں کو ملتی ہیں وہ بھی دائمی اور لافانی ہیں، بلکہ ایسے دلائل پاتے ہیں جو اس کے خلاف ثابت کرتے ہیں۔

زید بن ارقم نقل کرتے ہیں کہ اہل کتاب میں سے ایک شخص پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ آپ (ص) کا اعتقاد ہے کہ بہشتی کھاتے اور پیتے ہیں؟ پیغمبر اکرم (ص) نے جواب میں فرمایا: جی ہاں۔۔ سوال کرنے والے نے دوبارہ پوچھا کہ جو کھاتے اور پیتے ہیں، وہ کیسے حاجت بشری انجام دیتے ہیں؟ پیغمبر اکرم (ص) نے فرمایا: ان کے بدن سے یہ مواد خوشبو پسینہ کی صورت میں مشک آہو کے مانند خارج ہوتا ہے۔۔۔ [6]

بہ الفاظ دیگر، بہشتی نعمتیں ختم ہونے والی نہیں ہیں، بلکہ ان میں تغیر و تبدل ممکن ہے۔

مذکورہ توجہ کے پیش نظر اور پروردگار عالم کی قدرت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس دنیا کے منتخب افراد کے لئے بہشتی غذا عطا ہونے میں کوئی مشکل نہیں ہے۔

سوال کے تیسرے حصہ کے بارے میں یعنی بہشتیوں کے دنیا میں لوٹنے کے بارے میں قابل توجہ ہے کہ: اسلامی کتابوں میں بہشت وجہنم کے بارے میں دو معنی ملتے

ہیں:

اول: وہ بہشت جو انسان کے مرنے کے بعد برزخ میں شروع ہوتی ہے۔ ایک روایت مِن آیا ہے کہ ہر انسان کی قبر اس کے لئے بہشت کا ایک باغ یا جہنم کا ایک گڑھا ہوگی [7]۔ قرآن مجید میں مردوں کو زندہ کرنے کے جو واقعات پائے جاتے ہیں [8]، ان کے مطابق ایسے انسانوں کا اس قسم کی بہشت سے دنیا میں آنا ممکن ہے۔

دوم: جس بہشت اور جہنم میں انسان صور پھونکے جانے اور اعمال کے محاسبہ کے بعد داخل ہوں گے، قرآن مجید کی صراحت کے مطابق اس سے خارج ہونا ممکن نہیں ہے [9]، اور درحقیقت اس وقت اس دنیا کا وجود ہی نہیں ہوگا کہ انسان اس میں واپس آئے۔

حواشی

[1]. آل عمران، 37

[2] مجلسی، محمد باقر، بحارالانوار، ج 14، ص 195، مؤسسۃ الوفاء، بیروت، 1404 ھ.

[3]. عروسی حویزی، عبد علی بن جمعہ، نورالثقلین، ج 1، ص 333، انتشارات اسماعیلیان، طبع چہارم، قم، 1415.

[4]. تفسیر نمونہ، ج 2، ص 530؛ تفسیر المیزان، ج 3، ص 273 و 274.

[5]. تفسیر نمونہ، ج 2، ص 530.

[6] بحارالانوار، ج 8، ص 149، ح 82.

[7] بحارالانوار، ج 6، ص 214.

[8] آل عمران، 49.

[9] حجر، 48.

قرآن مجید میں کن حیوانات اور حشرات کا نام لیا گیا ہے؟

جواب

قرآن مجید میں تقریباً ۳۵ حیوانات کا نام آیا ہے۔قرآن مجید میں جن پرندوں اور حشرات کا نام آیا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

سلویٰ = بٹیر (بقرہ۔۵۷)،
بعوض = مچھر (بقرہ۔۲۶)
ذباب = مکھی (حج۔۷۳)،
نحل = شہد کی مکھی (نحل۔۶۸)،
عنکبوت = مکڑی (عنکبوت۔۴۱)،
جراد = ٹڈی (اعراف۔۱۳۳)،
ہدھد = ہدہد (نمل۔۲۷)،
غراب = کوا (مائدہ۔۳۲)،
ابابیل = ابابیل (فیل۔۳)،
نمل = چیونٹی (نمل۔۱۸)،
فراش = تتلی (قارعہ۔۴)،
قمل = جوں (اعراف۔۱۳۳)

مذکورہ موارد کے علاوہ چند دوسرے حیوانات کا بھی قرآن مجید میں نام آیا ہے۔

جیسے:

قردہ = بندر (بقرہ۔۶۵)،

بغال = خچر (نحل۔۸)،

غنم، نعجہ، ضان و معز = گوسفند (انعام۔ ۱۴۳۔۱۴۶)،

ذئب = بھیڑیا (یوسف۔ ۱۴)،

بعیر و جمل = اونٹ (یوسف۔ ۶۵ و اعراف۔ ۴۰۔۔)،

قسورہ = شیر (مدثر۔۵۱)،

خیل و جیاد (جمع جواد)

وصافنات (جمع صافنہ) =

اسب (نحل۔ ۸)،

بقر = گائے (بقرہ۔ ۷۰)،

عجل = گوسالہ (ہود۔ ۲۹)،

ثعبان = اژدھا (اعراف۔ ۱۰۷)،

حمار و حمیر = گدھا (نحل۔ ۸، بقرہ۔ ۲۵۹)،

خنزیر = سور (بقرہ۔ ۱۷۳)،

کلب = کتا (اعراف۔ ۱۷۶)،

نون و حوت = مچھلی (انبیاء۔ ۸۷، کہف۔ ۶۳)،

ضفادع = مینڈک (اعراف۔ ۱۳۳)،

فیل = ہاتھی (فیل۔۱)۔

اسی طرح جہالت کے زمانے کے عربوں میں رائج اونٹ اور بھیڑ کی مختلف نسلوں کے نام لئے جا سکتے ہیں، جیسے: بحیرہ، سائبہ، حام، وصیلہ (مائدہ۔ ۱۰۳)

کیا قرآن مجید اس مطلب کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ زرد فام، سرخ فام، بھورے اور سیاہ فام لوگوں سے سفید فام بہتر ہیں؟

وضاحت

قرآن مجید کے سورہ آل عمران (کی آیت نمبر ۱۰۷) میں خداوندمتعال ارشاد فرماتا ہے: اور جن کے چہرے سفید اور روشن ہوں گے وہ رحمت الٰہی میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ جبکہ یہ مطلب نسل پرستی پر مبنی ہے اور قابل بحث ہے۔ کیا قرآن مجید اشارہ کرتا ہے کہ زردفام، سرخ فام، بھورے اور سیاہ فام لوگوں سے سفید فام بہتر ہیں؟ اس کے علاوہ میں اس موضوع سے متعلق ایک اور سوال سے دوچار ہوا ہوں کہ ایک عالم دین جو یہاں منبر پر تھا نے کہا کہ: بہشتیوں کے اوصاف کے بارے میں ایک حدیث نقل کی گئی ہے، جس میں فرمایا گیا ہے کہ بہشت میں داخل ہونے والے افراد خوبصورت ہوں گے، یعنی اگر بوڑھے ہوں تو جوان ہوں گے، اگر بدصورت ہوں تو خوبصورت ہوں گے اور فقیر ہوں تو غنی ہوں گے اور معلول افراد صحیح و سالم اور تندرست ہوں گے۔ سرانجام اس نے بیان کہا کہ سیاہ فام لوگ، بہشت میں داخل ہوتے وقت سفید فام ہوں گے، جبکہ یہ مطلب نسل پرستی پر مبنی لگتا ہے،

کیونکہ سفید فام کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے، مہربانی کر کے اس موضوع پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

مختصر جواب

سورہ آل عمران کی ۱۰۷ ویں آیت یہ اعلان کرنا نہیں چاہتی ہے کہ سفید فام نسل کی انسانی قدر و قیمت دوسری نسلوں کی بہ نسبت بلند تر ہے۔ بنیادی طور پر اس قسم کی آیات کا انسانوں کے رنگ و نسل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ صرف ایسی اصطلاحوں سے استفادہ کیا جاتا ہے، جو قرآن مجید کی زبان، یعنی عربی زبان میں رائج ہیں۔ اس زبان میں، دوسری زبانوں کے مانند نیک انسانوں کو روسفید اور برے لوگوں کو روسیاہ کہا جاتا ہے اور اس سلسلہ میں ممکن ہے کہ ایک سیاہ فام شخص روسفید شمار ہو لیکن ایک سفید فام شخص روسیاہ شمار ہو۔ قلب سیاہ، رات کی سیاہی وغیرہ جیسی اصطلاحات ہرگز کسی نسل کی برتری بیان کرنا نہیں چاہتی ہیں۔

جس روایت کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے، اس کی کوئی محکم سند نہیں ہے اس کے بعض مطالب قابل تائید نہیں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جاننا چاہئے کہ جوانی، تندرستی اور خوبصورتی کے مانند اوصاف اس مادی دنیا میں صرف معنوی قدر و قیمت کے لحاظ سے نہیں جانے جاتے ہیں کہ بہشتی، جوان صورت میں مکمل تندرستی اور خوبصورت ترین شکل میں بہشت میں داخل ہو جائیں۔

تفصیلی جواب

سلام و دعا کے بعد سوال کی ابتدا میں ہم آپ سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ:

اگر ہم ایک تحریر میں پڑھیں کہ دن کی روشنی (سفیدی) میں رات کی تاریکی کی بہ نسبت مقصد تک بہتر صورت میں پہنچا جا سکتا ہے، تو کیا یہ سیاہ فاموں کے لئے توہین شمار ہوگی؟؛ اور اگر ہم ایک تبلیغاتی پوسٹر کو دیکھیں جس میں یہ لکھا ہو کہ فلاں دوا استعمال کرنے سے آپ کا چہرہ جوان ہوگا، تو کیا یہ بوڑھوں کے لئے توہین شمار ہوگا؟ یقیناً، ایسا نہیں ہے،

کیونکہ دن کی سفیدی اور رات کی سیاہی، کا انسانوں کے نسلی فرق سے کوئی تعلق نہیں ہے اگر چہ انسان کی چاہت ہوتی ہے کہ وہ خوبصورت ہو، لیکن ہمیں یقین ہے کہ ایک انسان کی انسانیت اور فضیلت انسان کے رنگ، جسمانی تندرستی اور اس کی ظاہری خوبصورتی پر مبنی نہیں ہے، اور اسی وجہ سے، بہت سے سیاہ فام افراد یا بظاہر معلول اور بدصورت انسان بلند انسانی قدروں کے مالک ہوتے ہیں اور بہت سے سفید فام اور بظاہر خوبصورت اور تندرست انسان اس قسم کی خصوصیات سے عاری ہوتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد ہم اصل سوال کی طرف پلٹتے ہیں اور آپ کے بیان کے پیش نظر قرآن مجید کی جس آیہ شریفہ اور ایک روایت کے بارے میں آپ کو ابہام پیدا ہوا ہے، ہم اس کا جواب دو حصوں میں پیش کرتے ہیں:

پہلا حصہ: سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۱۰۷:

اس سلسلہ میں قابل ذکر ہے کہ اس آیہ شریفہ کے بارے میں آپ کا تصور صحیح نہیں ہے، آپ شاید عربی زبان سے واقفیت نہ رکھنے کی وجہ سے سیاہ روئی کی اصطلاح جو عربی اور فارسی کے علاوہ بہت سی زبانوں میں استعمال ہوتی ہے، کو غلطی سے سیاہ رنگ سمجھے ہیں۔ مندرجہ ذیل مطالب پر غور کرنے سے آپ کو اس کی حقیقت سمجھ میں آئے گی:

قرآن مجید میں ایسی بکثرت آیات ملتی ہیں، جن میں انسانوں کے درمیان موجود تمام تفاوتوں کے باوجود ان کا ایک ہی سرچشمہ بیان کرتے ہوئے اعلان کیا گیا ہے کہ ہر انسان کی برتری اس کے تقویٰ اور پرہیزگاری پر مبنی ہوگی نہ کہ ان کے جسم، قوم اور نسل کی بنیاد پر۔ ایسی آیات کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

۱۔ انسانو؛ ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور پھر تم میں شاخیں اور قبیلے قرار دیئے ہیں تا کہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو، بیشک تم میں سے خدا

کے نزدیک زیادہ محترم وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے[1]۔

۲۔ انسانو؛ اس پروردگار سے ڈرو، جس نے تم سب کو ایک نفس سے پیدا کیا ہے اور اس کا جوڑا بھی اسی کی جنس سے پیدا کیا ہے اور پھر دونوں سے بکثرت مرد و عورت دنیا میں پھیلائے ہیں[2]۔

۳۔ وہی وہ ہے جس نے تم سب کو ایک نفس سے پیدا کیا ہے[3]۔

مذکورہ آیات میں غور وخوض کرنے سے سفید فاموں اور سیاہ فاموں کے درمیان کوئی فرق نہیں ملتا ہے اور پیغمبر اسلام (ص) اور ائمہ اطہار کی تاریخ کے مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ، سیاہ فام اور سفید فام، دوش بدوش دین اسلام کے لئے کام کرتے تھے۔

بعید ہے کہ کوئی شخص دین اسلام سے واقفیت رکھتا ہو، لیکن سیاہ فام بلال حبشی کو نہ جانتا ہو؛

البتہ، ممکن ہے اس زمانہ میں بھی کچھ افراد ہوں، جو جاہلیت کے چنگل سے آزاد نہ ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو سیاہ فاموں سے برتر جانتے تھے، لیکن ائمہ اطہار کی طرف سے اس قسم کے طرز تفکر کی مذمت کی گئی ہے۔

پیغمبر اسلام (ص) اپنے پیرووں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اے لوگو؛ آپ کا پروردگار ایک ہے اور آپ سب کے باپ حضرت آدم ہیں اور خود حضرت آدم بھی مٹی سے پیدا کیے گئے ہیں، خدا کے پاس آپ میں سے سب سے قابل قدر وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ کوئی عرب، غیر عرب پر برتری نہیں رکھتا ہے مگر یہ کہ وہ زیادہ پرہیزگار ہو[4]۔

مولا علی لوگوں کے درمیان کچھ مال بحصہ مساوی تقسیم فرما رہے تھے کہ اس کے مطابق ہر شخص کے حصہ میں تین دینار آتے تھے۔ انصار میں سے ایک شخص آیا اس نے تین دینار لے لئے اور اس کے بعد ایک سیاہ فام شخص آیا اور اس نے بھی اپنے تین دینار وصول

کیے۔

انصاری شخص نے تعجب سے امیرالمومنینؑ پر اعتراض کرتے ہوئے کہا: یہ سیاہ فام کل تک میرا غلام تھا، کیا یہ مناسب ہے کہ میرا اور اس کا حصہ مساوی ہو؟؛ امامؑ نے جواب میں فرمایا: تمہارے اس اعتراض کی کوئی دلیل نہیں ہے تم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے برتر نہیں ہے[5]۔

اسی قسم کے ایک واقعہ میں، امیرالمومنینؑ پر آپؑ کے بھائی عقیل کی طرف سے زبردست اعتراض کیا گیا کہ کیا میرا حصہ ایک سیاہ فام کے برابر قرار دیتے ہو؟؛ امامؑ نے ان کو متنبہ کرتے ہوئے فرمایا: صرف اگر تمہاری پرہیزگاری اس سے زیادہ ہو تو تم اس سے برتر ہو ورنہ تم دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے[6]۔

اس بنا پر کوئی انصاف پسند انسان، اسلام کے اس مبارزہ سے انکار نہیں کرسکتا ہے جو اس نے نسلی اور قومی امتیاز کے خلاف کیا ہے اور بعض اعلیٰ طبقہ کے افراد کی اسلام کے سلسلہ میں نامناسب کارکردگی کا سبب یہی امتیازی سلوک سے مبارزہ کرنا تھا اور کبھی اعلیٰ طبقہ کے افراد کی طرف سے اسلام قبول کرنے کے لئے نچلے طبقہ اور مستضعفین کو نکال باہر کرنے کی شرط رکھی جاتی تھی کہ خداوند متعال نے ایک آیت کو نازل کر کے پیغمبر اسلام (ص) کو ان کے اس ناحق مطالبہ کے قبول نہ کرنے کے بارے میں خبردار کیا ہے[7]۔

اگر آپ پورے قرآن مجید اور اسلامی کتابوں کا مطالعہ کریں گے، تو آپ کو کوئی ایسا واقعہ نہیں ملے گا جس میں ایک سیاہ فام شخص صرف اپنے نسل و رنگ کی وجہ سے مالکیت، ازدواج، شغل، وراثت اور اجتماعی زندگی کے دوسرے موضوعات سے محروم ہوا ہو بلکہ وہ تمام مواقع میں سفید فاموں کے برابر حقوق کا مالک رہا ہے۔ اس کے علاوہ آپ اس قسم کا کوئی مطلب نہیں پائیں گے جس کے مطابق کسی کے ثواب و عتاب کو ایک خاص نسل سے مخصوص

جانا گیا ہوگا اور اعلان کیا گیا ہوگا کہ معنوی مقامات پر فائز ہونے اور بہشت برین میں داخل ہونے کے لئے کسی اعلیٰ طبقہ کی نسل کو زیادہ حق حاصل ہے۔

اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ آپ کے سوال میں ذکر کی گئی آیہ شریفہ سے کیا مراد ہے اور اس میں کیوں قیامت کے دن سفید اور سیاہ رو کا ذکر کیا گیا ہے کہ پہلا گروہ خوش قسمت ہے اور دوسرے کو عذاب کیا جائے گا؟؛

جیسا کہ جواب کی ابتدا میں بیان کیا گیا، سیاہ رنگ اور سیاہ رو آپس میں فرق رکھتے ہیں۔ عربی اور فارسی زبانوں میں برے اور آلودہ باطن والے افراد کو روسیاہ کہتے ہیں، اگرچہ بظاہر یہ افراد سفید فام ہوں، لیکن اس کے مقابلے میں اس سیاہ فام شخص کو بھی روسفید کہتے ہیں جس کا دل پاک ہو۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

اور جب خود ان میں سے کسی کو لڑکی کی بشارت دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ خون کے گھونٹ پینے لگتا ہے[8]۔

ہم جانتے ہیں جہالت کے زمانہ میں عربوں میں لڑکیوں سے نفرت کی جاتی تھی، بظاہر وہ سفید فام تھے اور قطعاً یہ آیہ شریفہ سیاہ فاموں کے بارے میں نازل نہیں ہوئی ہے۔

اسی ترتیب سے، قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ پر، پیغمبر اسلام (ص) سے خطاب کر کے بیان کیا گیا ہے کہ: اور تم روز قیامت میں دیکھو گے کہ جن لوگوں نے اللہ پر بہتان باندھا ہے ان کے چہرے سیاہ ہو گئے ہیں۔[9] ظاہر ہے کہ یہ جھوٹے لوگ ممکن ہے سفید فام یا سیاہ فام ہوں؛

ایک فارسی شعر میں آیا ہے:

تا سیه روی شود، هرکه در او غش باشد

ہم یقین رکھتے ہیں کہ اس شعر کا انسان کے رنگ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس قسم

کے موارد بکثرت ہیں اور جو کچھ بیان ہوا، لگتا ہے کافی ہے۔

یہ جاننا دلچسپ ہے کہ کبھی سفید رنگ بھی انسانوں میں نقص کی علامت ہوتا ہے، مثال کے طور پر ہم قرآن مجید کی آیات میں پڑھتے ہیں کہ یوسفؑ کے فراق میں روتے روتے ان کے باپ، حضرت یعقوبؑ کی آنکھیں سفید ہو چکی تھیں [10]۔

ہم جانتے ہیں کہ یہاں پر سیاہی قابل قدر ہے اور سفیدی عیب ہے؛

اس بنا پر ایسے مواقع پر سفید اور سیاہ رنگ کا استفادہ کرنا سفید فاموں کی کوئی تمجید اور سیاہ فاموں کی کوئی توہین نہیں ہے ورنہ ہمیں کبھی دن کی سفیدی اور شب کی سیاہی، سفید قلب، سیاہ فکر و اندیشہ کے مانند جملوں کا استفادہ نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ اس سے نسلی امتیاز کی بو آتی ہے۔

سرانجام اس نکتہ پر توجہ کرنا ضروری ہے کہ، عربستان کے لوگ جو قرآن مجید کی آیات کے براہ راست مخاطب تھے، یورپی لوگوں کے مانند سفید فام نہیں تھے کہ اپنی سفیدی پر ناز کرتے، بلکہ ان میں سے اکثر کے چہرے سیاہی مائل تھے اور رومیوں کو بنی الاصفر یا زرد نسل کہا جاتا تھا، کیونکہ ان کا رنگ ان سے سفید تر تھا۔

اگر سفید فام ہونا خدا کے پاس برتر نسل ہونے کی دلیل ہوتی، تو پیغمبر اسلام کو بھی سفید ترین فرد ہونا چاہئے تھا، جبکہ آپ (ص) گندمی رنگ کے تھے [11]۔ دوسرے مردان الٰہی بھی سفید فام نہیں تھے، مثال کے طور پر لقمان حکیم، جن کے نام پر قرآن مجید کا ایک سورہ ہے اور اس میں ان کی نصیحتیں ہیں، ایک روایات کے مطابق ایک سیاہ فام غلام تھے اور ان کے ہونٹ موٹے تھے اور ان کا اصلی وطن حبشہ، موجودہ ایتھوپی تھا [12]۔

اسی بنا پر قرآن مجید کی آیات میں بیان کی گئی سفیدی اور سیاہی کو سیاہ فاموں کے لئے کوئی توہین نہیں سمجھا جا سکتا ہے بلکہ ان رنگوں سے قیامت کے حقائق بیان کرنا صرف اس

وجہ سے ہے کہ قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا ہے اور اس میں اس زبان کی اصطلاحات سے استفادہ کیا گیا ہے اور جس طرح بیان کیا گیا کہ اس زبان میں سفید روئی و سیاہ روئی کو نیک و بد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور اس کا افراد کے رنگ ونسل سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔

دوسرا حصہ: سوال میں اشارہ کی گئی روایت:

لیکن آپ کے سوال کے دوسرے حصہ کے بارے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ، بظاہر جس خطیب نے [آپ کے سوال میں اشارہ کی گئی] روایت بیان کی ہے، اس نے پیغمبر اکرم (ص) کی ایک روایت سے اپنی بات کی سند قرار دیا ہے کہ اس بنا پر پیغمبر اکرم (ص) نے قبیلہ اشجع کی ایک بوڑھی عورت سے فرمایا ہے کہ بوڑھی عورتیں بہشت میں داخل نہیں ہوں گی، وہ عورت ایک کونے میں جا کر رونے لگی۔ بلال حبشی، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موذن نے آنحضرت (ص) سے اس سلسلہ میں سوال کیا، پیغمبر اکرم (ص) نے جواب میں فرمایا: سیاہ فام بھی بہشت میں داخل نہیں ہوں گے، بلال نے یہ کلمہ سننے کے بعد اس عورت کا ساتھ دیا اور ایک کونے میں جا کر رونے لگے۔ آنحضرت کے چچا حضرت عباس نے جب یہ ماجرا دیکھا تو ثالثی کی غرض سے پیغمبر (ص) کی خدمت میں حاضر ہوئے، لیکن ان کو یہ جواب ملا کہ بوڑھے مرد بھی بہشت میں داخل نہیں ہوں گے اس کے بعد ان سب کو جمع کر کے ان کے دلوں کو جیتتے ہوئے اس مذاق کے اصلی مقصد کو یوں بیان فرمایا کہ: خداوندمتعال تمام افراد کو خوبصورت ترین شکل میں نورانی چہروں کے جوانوں کی صورت میں بہشت میں داخل کرے گا اور اس کے ضمن میں آنحضرت (ص) نے اشارہ فرمایا کہ اہل بہشت کے اضافی بال نہیں ہوں گے یہاں تک کہ داڑھی اور مونچھوں کے بغیر ہوں گے [13]۔

اب ہم، سند اور محتویٰ کے لحاظ سے اس روایت کے بارے میں تحقیق پیش کر رہے ہیں:

(۱)۔ اس روایت کی سند کے بارے میں قابل ذکر ہے کہ صحیح روایتیں نقل کرنے والی قابل اعتبار کتابوں میں اس روایت کا کہیں نام ونشان نہیں ملتا ہے اور مثال کے طور پر یہ روایت شیعوں کی کتب اربعہ میں موجود نہیں ہے۔

اس کے باوجود پانچویں اور چھٹی صدی کے دانشور ابن شہر آشوب نے اس روایت کو کسی سند [حتیٰ کہ غیر معتبر اور ضعیف سند] کے بغیر اپنی کتاب مناقب میں بیان کیا ہے اور اس کے صدیوں بعد اس روایت کو بحارالانوار اور مستدرک الوسائل میں بھی کسی سند کو بیان کیے بغیر درج کیا گیا ہے۔

اسی وجہ سے یہ روایت مرسل ہے اور اسلامی علماء کی نظر میں استناد کے لحاظ سے قدر ومنزلت نہیں رکھتی ہے۔

(۲)۔ البتہ بعض مرسل روایتوں سے دوسری دینی تعلیمات اور تاریخی حقائق کے مطابق ہونے کی وجہ سے استفادہ کیا جاسکتا ہے اور بہ الفاظ دیگر روایت کے مفہوم ومحتویٰ اس کی سند کے ضعیف ہونے کی تلافی کرسکتے ہیں۔

ہم اس روایت کو محتویٰ کے لحاظ سے کیسا پاتے ہیں؟

قابل ذکر ہے کہ اس روایت کا محتویٰ، کئی حصوں پر مشتمل ہے اور ان میں سے ہر حصہ کے لئے الگ تجزیہ اور فیصلہ کی ضرورت ہے:

(۱)۔ روایت کے پہلے حصہ کے بارے میں قابل ذکر ہے کہ اس کے محتویٰ کو قبول نہیں کیا جاسکتا ہے، کیونکہ ناممکن ہے کہ پیغمبر اسلام (ص)، اپنے اخلاق حسنہ کے باوجود جو باایمان افراد کے لئے اسوہ کے عنوان سے اعلان کیا گیا ہے [14]، مذاق کی غرض سے ہی

سہی، مختصر مدت کے لئے بھی دوسروں کو اذیت پہنچاتے، یہاں تک کہ مخاطب افراد گریہ و زاری کر کے آنسو بہاتے؛ دوسری جانب آنحضرت (ص) کے چچا عباس بھی سن و سال کے لحاظ سے آنحضرت (ص) سے زیادہ فرق نہیں رکھتے تھے اور وہ تھوڑا سا غور کر کے آنحضرت (ص) کی خدمت میں عرض کر سکتے تھے کہ اگر بوڑھے لوگ بہشت کے مستحق نہیں ہیں تو آپ (ص) اور مجھ میں کیا فرق ہے؟؛ اس بنا پر روایت کے پہلے حصہ کے بارے میں ایسے شواہد و قرائن پائے جاتے ہیں کہ اس کا صحیح ہونا ثابت نہیں ہوتا ہے۔

(۲)۔ لیکن اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ہم روایت کے دوسرے حصہ یا اسی مضمون کی ہر روایت کو قبول کریں اور اعتقاد رکھیں کہ بہشتی سب سے بہتر ممکنہ شکل میں بہشت میں داخل ہوں گے، کیونکہ اگر ایک عمر رسیدہ بوڑھا، جوانوں کی شکل میں، بے دست و پا معلول ایک تندرست انسان کی صورت میں یہاں تک کہ ایک سیاہ فام انسان، سفید اور نورانی صورت میں بہشت میں داخل ہوگا، تو یہ سب مادی دنیا میں ان افراد کی سابقہ حالت کی توہین نہیں ہے اور بڑھاپے، معلولیت اور رنگ و نسل کے لئے کوئی بے احترامی نہیں ہے۔

ذرا غور کیجیئے کہ اگر اس مادی دنیا میں بھی کچھ لوگ اظہار کرتے ہیں کہ سفید فاموں کی بہ نسبت سیاہ فام انسان قدر و منزلت سے پست تر ہیں، اس لئے انہیں کمتر اجتماعی امکانات فراہم کیے جانے چاہئیں، تو رائے عامہ کی طرف سے ایسے افراد کی مذمت کی جاتی ہے اور جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت کے مانند، وہ زوال و شکست سے دوچار ہوں گے، لیکن یہ کہنا کہ سفید فام، سیاہ فاموں سے خوبصورت تر ہیں، کسی قسم کی نسل پرستی نہیں ہے، اسی وجہ سے حقوق انسانی کے مدافع اور نسل پرستی کے خلاف کسی بھی کنونشن میں ہمیں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی ہے کہ دنیا کے تمام انسانوں کو زیبائی اور خوبصورتی کے لحاظ سے ایک ہی درجہ پر قرار دیا گیا ہو اور اسی فطری حقیقت کی بنیاد پر، بعض نسلیں دوسری نسلوں کی بہ نسبت خوبصورت تر

ہیں، حتی کہ خود سفید فاموں کے درمیان بھی خوبصورتی ایک ہی قسم کی نہیں ہوتی ہے۔ اس بنا پر اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ تمام انسان بہشت میں سفید اور نورانی صورت میں، سفید شکل میں نہیں بلکہ خوبصورت ترین ممکنہ صورت میں اور معلولیت اور بڑھاپے کی علامت کے بغیر اور حتیٰ کہ اضافی بالوں اور انسانی فضلات، بدبودار پسینہ سے پاک و منزہ ہوں گے اور یہ حالت ہر نسل کے انسانوں کی ہوگی اور اس طرح وہ بہشت میں ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔

ظاہر ہے کہ بہشتیوں کی اس قسم کی توصیف مادی دنیا میں ان کی سابقہ حالت کی توہین شمار نہیں کی جاسکتی ہے اور ممکن ہے کہ مادی دنیا کے خوبصورت ترین انسان قیامت میں عذاب سے دوچار ہوں اور بظاہر بدصورت انسان اپنے نیک اعمال کی وجہ سے بہشت کی جاودانی زندگی کے مستحق بنیں۔

حواشی

[1] حجرات، 13، يَآيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۳﴾

[2] نساء، 1، يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ

[3] انعام، 98، وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ

[4] تاج الدین الشعیری، جامع الاخبار، ص 183، انتشارات رضی، قم، 1363ھ ش.

[5] کلینی، محمد بن یعقوب، کافی، ج 8، ص 69، ح 26، دار الکتب الاسلامیۃ، تہران، 1365ھ ش.

[6] ایضاً، ج 8، ص 182، ح 204.

[7] انعام، 52، وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ

مِنَ الظّٰلِمِیْنَ﴿۵۲﴾

[8]نحل، 58،وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ﴿۵۸﴾؛ زخرف، 17.

[9]زمر، 60،وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ؕ

[10]یوسف، 84،وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ

[11] مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، ج 16، ص 144، مؤسسۃ الوفاء، بیروت، 1404ھ عربی زبان میں گندمی رنگ کے انسان کو اسمر کہتے ہیں.

[12] بحارالانوار، ج 13، ص 423.

[13] محدث نوری، مستدرک الوسائل، ج 8، ص 410، ح 9826، مؤسسۃ آل البیت، قم، 1408ھ.

[14]احزاب، 21، لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا﴿۲۱﴾

اسلامی روایات کے مطابق روح کی ماہیت کیا ہے اور قرآن مجید میں اس سلسلہ میں کیوں وضاحت نہیں کی گئی ہے؟

قرآن مجید میں ایک آیہ شریفہ ہے، جس کا مضمون یہ ہے کہ: اور پیغمبر؛ یہ آپ سے روح کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو کہہ دیجئے کہ یہ میرے پروردگار کا ایک امر ہے اور تمہیں بہت تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔ (اسراء۔۸۵)۔ مہربانی کر کے فرمایئے، کہ، اولاً: پیغمبر(ص) روح کے بارے میں اس سے زیادہ معلومات کیوں پیش کرنا نہیں چاہتے تھے؟ ثانیاً: احادیث کے مطابق، روح کیا ہے؟ کیا یہ دیکھنے کے قابل ہوگی؟

مختصر جواب

مختلف علوم میں لفظ روح کے معنی مختلف ہیں اور اس لفظ کے ہر علم میں اپنے خاص معنی ہیں اور قرآن مجید کی اصطلاح میں بھی اس کے خاص معنی ہیں اور اس لفظ کو مختلف تعبیرات میں استعمال کیا گیا ہے۔

اس آیہ شریفہ میں روح کے معنی میں سے کس معنی کی ماہیت مدنظر ہے، اس کے بارے میں چند احتمالات پیش کیے گئے ہیں، **من جملہ:** روح حیوانی، روح انسانی (نفس

ناطقہ)، روح القدس یا جبرئیل اور روح، ملائکہ سے برتر مخلوق کے معنی میں۔ لیکن جو کچھ مسلم ہے وہ یہ ہے کہ اس سے مراد علم طب میں بیان کی جانے والی روح حیوانی نہیں ہوسکتی ہے۔ کیونکہ اس روح کی پہچان علوم کی دسترس سے دور نہیں ہے۔ اسی طرح اس روح سے جبرئیل بھی مراد نہیں لئے جاسکتے ہیں، کیونکہ بعض آیات میں اس روح یعنی جبرئیل کو ملائکہ کے ساتھ اور ان سے ایک متمایز امر کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے اور بعض روایتیں بھی اس مطلب کی صراحت کے ساتھ دلالت پیش کرتی ہیں۔

اس آیہ شریفہ کے مطابق، روح کی ماہیت کے بارے میں صرف اسی حد تک کہا جا سکتا ہے کہ روح ایک مجرد حقیقت ہے اور امر الٰہی کی ایک قسم ہے اور جو امر خداوند متعال سے منسوب ہو، وہ زمان و مکان اور دوسری مادی خصوصیات سے بالاتر ہوتا ہے۔

اس قسم کے الٰہی امر کی کیفیت اور مراتب کا ادراک کرنا، علوم کشفی کے اسرار میں شمار ہوتا ہے اور یہ تصور نہیں کرنا چاہئے کہ خود پیغمبر (ص) بھی ان امور سے بہرہ مند نہیں تھے، لیکن چونکہ لوگوں کی اکثریت میں اس قسم کا ادراک نہیں پایا جا سکتا ہے، اس لئے اس سلسلہ میں کچھ بیان کرنا عقل کے لئے حیرت ناک تھا، لہٰذا، بظاہر قرآن مجید میں روح کی پہچان کے سلسلہ میں زیادہ وضاحت پیش نہیں کی گئی ہے۔

مذکورہ بیان سے ظاہر ہے کہ، چونکہ روح، زمان و مکان اور دوسری تمام مادی خصوصیات سے بالاتر ایک حقیقت ہے، اس لئے حس کے ذریعہ قابل ادراک اور ظاہری آنکھوں سے دیکھنے کے قابل نہیں ہے، لیکن روح کے بعض اثرات اور تمثیلیں لطیف مادہ کے قالب میں آشکار ہوسکتی ہیں، من جملہ مثالی بدن میں، جو عالم برزخ میں روح کا قالب ہے۔

یہ قابل ذکر ہے کہ بعض علوم کی اصطلاح میں اور اسی طرح بعض روایتوں کی تعبیرات کے مطابق بظاہر اسی مثالی بدن کو روح کہا گیا ہے، کیونکہ یہ بدن، روح کے مادی

جسم سے جدا ہونے کے بعد، اس کا حامل ہوتا ہے اور روحانی اثرات کو زیادہ تر آشکار کر سکتا ہے۔ یہ مثالی بدن، اپنے عالم میں دیکھنے اور کشف کرنے کے قابل ہوتا ہے، لیکن اس کا اس روح کی حقیقت سے موازنہ نہیں کرنا چاہئے جو خداوندمتعال سے منسوب ہے اور امر الٰہی کی ایک قسم ہے، کیونکہ عالم ہستی میں اس روح کا مقام امور سے بالاتر ہوتا ہے اور یہ اسرار الٰہی میں شمار ہوتا ہے۔

تفصیلی جواب

ادیان، حکمت، فلسفہ اور عرفان میں ایک اہم اور بنیادی بحث، انسانی اور عالمی جہت سے روح کی پہچان ہے۔ روح کی ماہیت کے بارے میں اسلامی متکلمین اور فلاسفہ نے مختلف اقوال بیان کیے ہیں اور آیات و روایات میں بھی اس سلسلہ میں اجمالی طور پر کچھ مطالب بیان کیے گئے ہیں، لیکن قرآن مجید کے معنی میں (جس میں زیادہ تر ملائکہ سے بالاتر حقیقت کی طرف اشارہ ہے) کلی طور پر روح کی حقیقت ظاہری علوم اور دانشوروں کے افکار کی پہنچ سے بالاتر ہے اور اس کے لئے کشفی معرفت کی ضرورت ہے، جیسا کہ کہا گیا ہے کہ معرفت نفس ہی معرفت رب ہے اور وہی روح کی حقیقت کی شناخت ہے[1]۔

روح سے کیا مراد ہے؟

قابل ذکر ہے کہ مختلف علوم میں لفظ روح سے مراد مختلف ہے اور یہ لفظ ہر علم میں، خواہ قدیم علوم میں، خواہ جدید علوم میں، خاص اصطلاحی معنی رکھتا ہے اور قرآن مجید کی اصطلاح میں بھی اس کے خاص معنی ہیں کہ مختلف تعبیرات کے ضمن میں اس کا استفادہ کیا گیا ہے من جملہ لفظ الروح[2] مطلق طور پر روحی[3] روح منہ[4]، روح الامین[5]، روح القدس[6] وغیرہ۔

سورہ اسراء کی آیت نمبر ۸۵ میں روح:

قرآن مجید کی آیات میں سے ایک آیت، جس میں روح کی ماہیت کے بارے میں اجمالی اشارہ کیا گیا ہے، وہ سورہ اسراء کی آیت نمبر ۸۵ ہے کہ ارشاد ہوتا ہے: سئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی و ما اوتیتم من العلم الا قلیلاً پیغمبر؛ یہ آپ سے روح کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو کہہ دیجئے کہ یہ میرے پروردگار کا ایک امر ہے اور تمہیں بہت تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔

اس آیہ شریفہ میں روح سے مراد کون سی روح ہے، اس سلسلہ میں پہلے چند احتمالات پیش کیے جاتے ہیں، من جملہ: روح حیوانی، روح انسانی (نفس ناطقہ)، روح القدس یا جبرئیل اور روح، ملائکہ سے برتر مخلوق کے معنی میں۔ لیکن جو کچھ مسلم ہے وہ یہ ہے کہ اس سے مراد علم طب میں بیان کی جانے والی روح حیوانی نہیں ہوسکتی ہے۔ کیونکہ اس روح کی پہچان علوم کی دست رس سے دور نہیں ہے۔

اسی طرح اس روح سے مراد جبرئیل بھی نہیں ہیں، کیونکہ مذکورہ آیت کے علاوہ قرآن مجید کی دوسری متعدد آیات میں لفظ روح کو دہرایا گیا ہے اور اس قرینہ کے پیش نظر کہ اس لفظ کو ملائکہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے (الملائکۃ و الروح) اس لئے مسلم طور پر یہ ملائکہ کے علاوہ ہے اور بعض روایتوں کی صراحت کے مطابق اس تمایز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ علامہ طباطبائی، وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ط والی آیت میں روح کی کیفیت کے بارے میں کہتے ہیں: روح بظاہر جبرئیل اور غیر جبرئیل کے علاوہ ایک بہت ہی وسیع تر مخلوق ہے۔

یہاں پر ہم بعض ان روایتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جو روح کے، ملائکہ اور جبرئیل کے علاوہ ہونے کی دلیل پیش کرتی ہیں:

۱۔ اتی رجل امیر المومنین علیہ السلام یسأله عن الروح الیس ھو جبرئیل

فقال له امير المومنينؑ : جبرئيل من الملائكه و الروح غير جبرئيل[7]؛

ایک شخص نے حضرت علیؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھا: کیا روح وہی جبرئیل ہیں؟ حضرتؑ نے جواب میں فرمایا: جبرئیل ملائکہ میں سے ہیں اور روح جبرئیل کے علاوہ ہے۔

۲۔ عَنْ أَبِي بَصِيرٍ قَالَ سَأَلْتُ أَبَا عَبْدِ اللهِؑ عَنْ قَوْلِ اللهِ عَزَّ وَ جَلَّ يَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي قَالَ خَلْقٌ أَعْظَمُ مِنْ جَبْرَئِيلَ وَ مِيكَائِيلَ كَانَ مَعَ رَسُولِ اللهِ ص وَ هُوَ مَعَ الْأَئِمَّةِ وَ هُوَ مِنَ الْمَلَكُوتِ؛[8]۔

ابی بصیر نے امام صادقؑ سے خداوندمتعال کے اس قول: يسئلونك عن الروح قل الروح من امر ربی کے بارے میں سوال کیا۔ حضرتؑ نے جواب میں فرمایا: یہ جبرئیل اور میکائیل سے عظیم تر ایک مخلوق ہے، جو رسول خدا (ص) کے ہمراہ تھی اور ائمہ اطہارؑ کے ساتھ ہے اور عالم ملکوت میں سے ہے۔

اس کے باوجود ہم بعض آیات میں دیکھتے ہیں کہ جبرئیل کو روح الامین کے طور پر متعارف کیا گیا ہے، لیکن ان دو مطالب کی وجہ جمع، علامہ طباطبائی کے اشارہ کے مطابق، قرآن مجید کے اشاروں سے قابل استنباط ہے اور وہ یہ کہ جبرئیل اور ملائکہ روح کو اپنے تنزل و ترقی کے سلسلہ میں حمل و نقل کرنے والے ہیں اور اس کا ساتھ دیتے ہیں اور اسی لحاظ سے روح ایک صورت میں ملائکہ اور جبرئیل کی لازم و ملزوم ہے اور ایک صورت میں ان سے الگ ہے[9]۔

قرآن مجید اور سورہ اسراء کی آیت ۸۵ میں روح کی ماہیت:

روح کی ماہیت اور حقیقت کے بارے میں، خداوندمتعال نے مذکورہ آیہ شریفہ

میں اجمالی طور پر بیان فرمایا ہے: قل الروح من امر ربی۔ کہد یجیئے کہ روح میرے پروردگار کا ایک امر ہے۔ امر الٰہی کی ماہیت ہمارے لئے ظاہر ہونے کے لئے بعض آیات کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے، من جملہ آیہ شریفہ: انما امرہ اذا اراد شیئاً ان یقول لہ کن فیکون [10] اس کا امر صرف یہ ہے کہ کسی شیئے کے بارے میں یہ کہنے کا ارادہ کر لے کہ ہو جا اور وہ شیئے ہو جاتی ہے۔

علامہ طباطبائی نے تفسیر المیز ان میں اس آیہ شریفہ کے بارے میں فرمایا ہے کہ روح امر الٰہی کی ایک قسم ہے اور ذات الٰہی کے فصل کے بارے میں مخصوص ہے، اسی لحاظ سے روح بھی امر الٰہی کی ایک قسم ہے اس لئے اس کا زمان و مکان اور کسی دوسری مادی چیز سے موازنہ نہیں کیا جاتا ہے [11]۔

اس روح کی قرآن مجید میں مختلف تعبیروں سے توصیف کی گئی ہے، اول یہ کہ اسے الگ اور مطلق طور پر ذکر کیا گیا ہے، جیسے مذکورہ آیت میں، اس کے علاوہ کبھی ملائکہ کے ہمراہ ذکر کیا گیا ہے اور کبھی وہ حقیقت ہے جو عام انسانوں میں پھونکی جاتی ہے اور کبھی وہ حقیقت ہے جو مومنین کی ہمراہی اور ان کی تائید کرتی ہے اور کبھی ایک ایسی حقیقت ہے جس کے ساتھ انبیاء کا رابطہ ہے۔

روح کی ماہیت کے بارے میں

روح کی ماہیت کے بارے میں صرف اسی حد تک کہا جا سکتا ہے کہ روح ایک مجرد حقیقت ہے اور امر الٰہی کی ایک قسم ہے اور جو امر خداوند متعال سے منسوب ہو، وہ زمان و مکان اور دوسری مادی خصوصیات سے بالاتر ہوتا ہے۔ لیکن اس امر الٰہی کی کیفیت اور مراتب کو سمجھنے کے لئے شہودی علم کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ علم اسرار مکاشفہ شمار ہوتا ہے اور چونکہ اکثر لوگ اس قسم کے ادراک سے عاری ہوتے ہیں، لہٰذا اس سلسلہ میں بات کرنا عقل کے

لئے قابل حیرت وتعجب ہوتا ہے اور شائد ضلالت کا سبب بھی ہو۔ اس بنا پر قرآن مجید میں روح کی پہچان کے بارے میں زیادہ تفصیلات بیان نہیں ہوئی ہیں۔

اس لحاظ سے یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ خود پیغمبر (ص) بھی اس علم سے بہرہ مند نہیں تھے، اسی طرح روح کی ماہیت کو پہچاننا کشف ویقین کی منزل میں ہے اور یہ عارفوں کا مقام ہوتا ہے اور جو لوگ اس علم سے محروم ہیں ان کے لئے اس کا بیان کرنا عملی طور پر کوئی فائدہ نہیں دیتا ہے [12]۔

لیکن جملہ: وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا﴿۸۵﴾ کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ اس مسئلہ سے علماء نے بظاہر استفادہ کیا ہے وہ مشتے ازخروارے ہے اور روح کی حقیقت ایک بالاتر امر ہے اور اسے حاصل کرنا کشفی علوم کے علاوہ ممکن نہیں ہے۔

روح، زمان ومکان اور مادی خصوصیات سے بالاتر ایک حقیقت

مذکورہ بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ، چونکہ روح، زمان و مکان اور دوسری مادی خصوصیات سے بالاتر ایک حقیقت ہے، اس لئے حس کے ذریعہ قابل ادراک ہے اور بظاہر دیکھنے کے قابل نہیں ہے، اگرچہ معصومینؑ کے لئے روح کی حقیقت کے سلسلہ میں مکاشفہ اور شہود قلبی ممکن ہے اور شاید عرفا بھی اجمالی طور پر اس شہود سے مستفید ہوں اور روح کے مجرد ہونے سے اس کی کوئی منافات نہیں ہے، اس طرح روح کے بعض اثرات اور تمثلیں (نہ کہ ذاتی طور پر خود روح) لطیف جسم کے قالب میں آشکار ہوسکتی ہیں اور مثالی صورت میں، من جملہ عالم برزخ کے مثالی بدن میں قابل مکاشفہ ہیں، جو دنیوی جسم کے مشابہ ہوتا ہے لیکن لطافت ونورانیت کے لحاظ سے مثالی جسم دنیوی جسم سے بالاتر ہوتا ہے۔

قابل ذکر بات ہے کہ بعض علوم کی اصطلاحات میں اور بعض روایتوں کی تعبیرات میں اسی مثالی جسم کو روح کہا گیا ہے، کیونکہ یہ جسم روح کو مادی جسم سے جدا ہونے کے بعد

اٹھانے والا ہوتا ہے اور کافی حد تک روح کے اثرات کو آشکار کرسکتا ہے۔ یہ مثالی جسم، مجرد محض نہیں ہوتا ہے اس لئے مثالی حالت میں قابل دید و مکاشفہ ہے۔ دوسری جانب، اس کا روح کی حقیقت، جو خدا سے منسوب ہے اور امر الٰہی کی ایک قسم ہے، سے موازنہ نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ عالم ہستی میں روح کا مقام ان امور سے بالاتر ہے اور اسرار الٰہی میں شمار ہوتا ہے۔

حواشی

[1] احمد بن محمد حسین اردکانی، مرآت الاکوان (تحریر شرح ہدایہ ملاصدرا)، ص37، ناشر، میراث مکتوب.

[2] الاسراء، 85؛ غافر، 15.

[3] الحج، 29؛ صاد، 72.

[4] المجادلہ، 22؛ النساء، 171.

[5] الشعراء، 193.

[6] بقرہ، 87 و 253؛ مائدہ، 110؛ نحل 102.

[7] کلینی، کافی، ج 1، ص 274، دار الکتب الاسلامیۃ، تہران، 1365ھ ش.

[8] کافی، ج1، ص273.

[9] طباطبائی، سید محمد حسین، المیزان، موسوی ہمدانی، سید محمد باقر، ج13، ص 171۔ 172، جامعہ مدرسین، قم، 1374.

[10] یس، 82.

[11] المیزان، ج1، ص528۔ 529.

[12] مرآت الاکوان (تحریر شرح ہدایہ ملاصدرا)، ص36.

اس بات کو مدّنظر رکھتے ہوئے کہ قرآن مجید میں دعا کے دوران خود کو دوسروں پر مقدم کرنے کا حکم ہے "علیکم انفسکم" جناب زہرا سلام اللہ علیہا کے ذریعہ اپنی دعاؤں میں دوسروں کو مقدم کرنے کی کس طرح سے توجیح کی جا سکتی ہے؟

ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف تو قرآن مجید میں "علیکم انفسکم" جیسی آیتیں موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ دعائیں پہلے اپنے لئے پھر اپنے اقرابتداروں اور پھر اسکے بعد باقی مومنوں کے لئے کریں اور دوسری طرف ایسی روایتیں بھی ملتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ (س) پہلے دوسروں کے لئے دعائیں فرماتی تھیں آپ اس ظاہری تناقض اور ٹکراؤ کی کیسے توجیح کرتے ہیں اور ہم اپنی دعاؤں میں کس ترتیب کی رعایت کریں

مختصر جواب

تزکیہ اور اصلاح نفس کے مرحلہ میں انسان کو چاہیے کہ خود کو دوسروں پر مقدم رکھے اور یہی حکم قرآن میں بھی ہے اور مفہوم روایات بھی کیونکہ اپنے تزکیہ کے بغیر دوسروں کی ہدایت کم محقق ہوتی ہے لیکن مقام دعا میں بہت مناسب ہے کہ انسان دوسروں کو خود پر مقدم

کرے اور ہماری روایات میں اس سلسلے میں بہت تاکید زیادہ تاکیدات وارد ہوئی ہیں اس کام سے نہ صرف یہ کہ انسان کی حاجتیں پوری ہوتی ہیں بلکہ تاخیر کا باعث نہیں ہوتا اور بلکہ دعاؤں کے جلد قبول ہوجانے کا سبب بنتا ہے

تفصیلی جواب

بظاہر سوال میں تزکیہ نفس اور دعا کے درمیان خلط مسلط واقع ہوا ہے کیونکہ پہلی صورت یعنی اصلاح نفس اور پرہیز گاری کے مرحلہ میں آیات وروایات سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ انسان کے لئے ضروری ہے خود کو دوسروں پر مقدم کرے قرآن مجید آتش جہنم سے بچنے اور تزکیہ نفس کے ذریعہ خود کو زائل اخلاقی سے دور رکھنے کے لئے مومنوں کو کچھ اس طرح سے خطاب کرتا ہے اے مومنو: اپنی فکر کرو اور خود کو (ضلالت گمراہی اور اللہ کی نا فرمانی) سے محفوظ رکھو اگر تم مومن بن کر رہو گے تو کافر تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے [1]

اسی طرح قرآن کی دوسری آیت میں آیا ہے کہ اے مومنو: خود کو اور اپنے قرابتداروں کو اس آگ سے بچاؤ کہ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہونگے (یعنی گناہ کرکے اپنے آپ کو ایسی آگ کے حوالے نہ کرو)[2]

جیسا کہ آپ محسوس کرتے ہیں یہاں گفتگو دعا اور عبادت کی نہیں ہو رہی ہے بات اصلاح نفس اور زائل اخلاقی سے دوری کی ہے جس میں ضروری ہے کہ انسان خود کو اور اپنے اقرباء کو دوسروں پر مقدم کرے البتہ یہ بات امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک کرنے کے مترادف نہیں ہے کیونکہ واجبات کی انجام دہی بھی بذات خود اصلاح نفس کا ایک ذریعہ ہے جسے خودسازی کے بہانے سے ترک کیا جا سکتا ہے

لیکن دعا اور طلب حوائج کا مسئلہ جیسا کہ متعدد روایات سے بھی ظاہر ہوتا ہے اس کے بلکل برعکس ہے کیونکہ معصومینؑ حضرات کی روایات کے مطابق اس مرحلہ میں دوسروں کو

خود پر ترجیح دینے کی طرف رغبت دلائی گئی ہے جیسا کہ ایک روایت حضرت امام حسن نے اپنی والدہ ماجدہ کے سلسلے میں نقل فرمائی ہے اور مزکور سوال کے متن میں یہ عبارت آئی ہے کہ حضرت زہراؑ نے امام حسنؑ کے سوال کے جواب میں فرمایا ((الجارثم الدار)) پہلے پڑوسی ہیں پھر ہم خود۔[3]

دوسری جگہ امام سجادؑ سے روایت ہوئی ہے کہ جب فرشتے سنتے ہیں کہ ایک مومن دوسرے مومن کے پیٹھ پیچھے اس کے لئے دعائے خیر کر رہا ہے یا اسکو اچھے الفاظ میں یاد کر رہا ہے تو اسکو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں: تم کتنے اچھے بھائی ہو اپنے مومن بھائی کے حق میں دعائے خیر کر رہے ہو اس حالت میں کہ وہ تمہارے سامنے نہیں ہے اور تم اس کی اچھائی بیان کر رہے ہو حقیقتاً جتنا تم نے اپنے بھائی کے لئے مانگا ہے خداوند عالم اسکا دوگنا عطا کرے گا [4] اس کے جیسی اور بھی بہت سی روایت ملتی ہیں مثلا وسائل الشیعہ میں باب الستحباب اختیار الانسان الدّ عاءللمومن علی الدعاءلنفسیہ)

(دوسروں کے لئے دعا کو اپنے حق میں دعا پر ترجیح دینا)) عنوان کے تحت ایک باب موجود ہے اور اس بات میں بہت سی ایسی دعاؤں کو ذکر کیا گیا ہے جس میں دوسروں کے حق میں دعا کرنے کو خود پر ترجیح دینے کی طرف ترغیب دلائی گئی ہے۔

حواشی

[1]۔ مائدہ: ۱۰۵۔

[2]۔تحریم:٦۔

[3]۔شیخ حر عاملی، وسائل الشیعہ، ج۷،ص ۱۱۲، باب استحباب اختیار الانسان الدعاءللمومن علی الدعاءلنفسہ، موسسہ آل البیت،قم۔

[4]۔ ہمان،ص۱۱۱۔

"وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿۲۲﴾" میں صف کے کیا معنی ہیں؟

جواب

یہ لفظ اور اس کے مشتقات قرآں کی دوسری آیتوں میں بھی استعمال ہوئے ہیں [1]۔صف کے معنی ایک لائن اور ایک صف میں چیزوں کو قرار دینا ہے مثلاً لوگوں کی صف، درختوں کی صف (قطار) [2]۔

"صفا" اس آیہ مبارکہ میں ادبی نقطہ نظر سے ملائکہ کے لئے، حال ہے اور معنی کے اعتبار سے مفسرین نے اس کی کئی احتمال دیے ہیں جن میں سے بعض ذیل میں بیان کئے جاتے ہیں:

مراد یہ ہے کہ ملائکہ مختلف صفوں میں آئیں گے اور یہ صف بندی ان کی مرتبوں اور درجوں کی بنیاد پر ہے [3]

اس سے مراد ہر ایک آسمان کے ملائکہ کا نزول ہے لہٰذا وہ ترتیب سے صف میں کھڑے ہوں گے وہ بھی اس طرح کے انسانوں اور جنوں کا احاطہ کئے ہوں گے [4]

بعض مفسروں نے اسے نماز جماعت سے تشبیہ دیا ہے کہ ملائکہ ایک دوسرے کے پیچھے صف در صف حاضر ہوں گے۔[5]

حواشی

[1] کہف۔ ۴۸؛ طہ۔ ۶۴؛ حج۔ ۳۶و۔۔۔

[2] راغب اصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، ص ۴۸۶، دارالعلم الدار الشامیۃ، دمشق ۔ بیروت، ۱۴۱۲ق

[3] بیضاوی، عبداللہ بن عمر، أنوار التنزیل و أسرار التأویل، ج ۵، ص ۳۱۱، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۸ق

[4] زمخشری، محمود، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل، ج ۴، ص ۷۵۱، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۰۷ق

[5] طوسی، محمد بن حسن، التبیان فی تفسیر قرآن، ج ۱۰، ص ۳۴۷، دار احیاء التراث العربی، بیروت، بی جا، بی تا

قلب سلیم سے کیا مراد ہے؟

مختصر جواب

لفظ سلیم، سلم و سلامت سے ہے اور اس کے معنی ظاہری و باطنی آفتوں سے دور رہنا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس لفظ سے مراد کے بارے میں فرمایا ہے کہ: قلب سلیم، ایک ایسا دل ہے جو اپنے پروردگار سے اس حالت میں ملاقات کرتا ہے کہ اس کے سوا اس میں کوئی اور نہ ہو۔

قرآن مجید کے مفسرین نے بھی قلب سلیم کے لئے متعدد تفسیریں کی ہیں کہ ان میں سے ہر ایک میں اس مسئلہ کے ایک پہلو کی طرف اشارہ ہے، مثال کے طور پر، قلب سلیم وہ دل ہے جو شرک سے پاک ہو یا وہ دل جو گناہ، کینہ و نفاق سے پاک ہو یا وہ دل جو دنیوی عشق سے عاری ہو، کیونکہ دنیا کی محبت تمام خطاؤں کا سرچشمہ ہے۔ اور سرانجام وہ دل جس میں خدا کے سوا کوئی اور نہ ہو۔

تفصیلی جواب

قرآن مجید کے الفاظ میں سے ایک لفظ قلب سلیم ہے، یہ ایک انتہائی خوبصورت اور بامعنی لفظ ہے۔ لفظ سلیم، سلم و سلامت سے ہے اور اس کے معنی ظاہری و باطنی آفتوں سے دور رہنا ہے[1]۔

قلب سلیم کی دلچسپ اور بہترین تعریف حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے کی ہے کہ فرماتے ہیں: اَلْقَلْبُ السَّلِیمُ الَّذِی یلْقَیرَبَّهُ وَ لَیسَ فِیهِ أَحَدٌ سِوَاهُ[2] یعنی، قلب سلیم، ایک ایسا دل ہے جو اپنے پروردگار سے اس حالت میں ملاقات کرتا ہے کہ اس کے سوا اس میں کوئی اور نہ ہو۔

ایک دوسری روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: صاحِبُ النِّیةِ الصّادِقَةِ صاحِبُ الْقَلْبِالسَّلِیمِ، لِأَنَّ سَلامَةُ الْقَلْبِ مِنْ هَواجِسِ الْمَحْذُوراتِبِتَخْلِیصِ النِّیةَ لِلّٰهِفِی الأُمُورِ کُلِّها[3] جس کی نیت صادق ہو، وہ قلب سلیم کا مالک ہے، کیونکہ دل کا شرک و شک سے پاک ہونا، تمام چیزوں میں نیت کو خالص بناتا ہے۔ اس بنا پر امام جعفر صادق علیہ السلام پاک اور خالص نیت رکھنے والوں کو قلب سلیم کے مالک جانتے ہیں۔

قلب سلیم کے بارے میں اتنا ہی کافی ہے کہ قرآن مجید نے اسے قیامت میں نجات پانے کا تنہا سرمایہ شمار کیا ہے۔ چنانچہ سورہ شعراء میں ارشاد ہوا ہے: یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ﴿۸۹﴾[4] جس دن مال اور اولاد کوئی کام نہ آئے گا، مگر وہ جو قلب سلیم کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہو۔

قرآن مجید کے مفسرین نے بھی قلب سلیم کے لئے متعدد تفسیریں کی ہیں کہ ان میں سے ہر ایک میں اس مسئلہ کے ایک پہلو کی طرف اشارہ ہے:

۱۔ قلب سلیم، وہ دل ہے جو شرک سے پاک ہو۔

۲۔ قلب سلیم، وہ دل ہے جو گناہ، کینہ اور نفاق سے پاک ہو۔

۳۔ قلب سلیم، وہ دل ہے جو دنیوی عشق سے عاری ہو، کیونکہ دنیا کی محبت تمام خطاؤں کا سرچشمہ ہے۔

۴۔ سرانجام، قلب سلیم، وہ دل ہے، جس میں خداوندمتعال کے سوا کوئی اور نہ ہو؛

جیسا کہ بیان کیا گیا، سلیم، مادہ سلامت سے ہے اور جب مطلق سلامت کی بات کی جاتی ہے تو سلامتی ہر قسم کی اخلاقی و اعتقادی بیماری سے سلامتی پر مشتمل ہوتی ہے۔

اس بنا پر قلب سلیم رکھنے والے کا دل اس دنیا میں بھی غیر خدائی امور سے خالی ہوتا ہے، کیونکہ نفسانی خواہشات، اقتدار کی پیاس، زیادہ خواہی، اخلاقی برائیاں وغیرہ جیسے امور قلب سلیم سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے ہیں۔

مختصر یہ کہ قلب سلیم، ایک ایسا دل ہے، جس میں کسی قسم کی غیر خدائی وابستگی نہ پائی جاتی ہو اور وہ دل خداوندمتعال کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہو۔ جیسا کہ ہم دُعا میں پڑھتے ہیں: الٰهی هب لی کمال الانقطاع الیك خداوندا؛ مجھے تمام چیزوں سے رابطہ منقطع کر کے اپنی طرف پلٹنے کی سعادت عطا فرما۔

اس سلسلہ میں مزید آگاہی کے لئے آیت اللہ شہید دستغیب کی کتاب قلب سلیم کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

حواشی

[1] راغب اصفہانی، مفردات الفاظ قرآن کریم، مادہ سلم.

[2] کلینی، کافی، ج 2، ص 16، دارالکتب الاسلامیۃ، تہران، 1368 ھ ش.

[3] مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، ج 67، ص 210، موسسہ الوفاء، بیروت، 2404 ہ.

[4] شعراء، 88، 89.

امام علیؑ نے پیدائش کے بعد آغوش پیغمبرؐ میں قرآن مجید کی کئی آیات کی تلاوت کی ہے، پیغمبرؐ کی رسالت اور آپؐ کے قرآن مجید کے محتویٰ سے رسالت سے پہلے عدم آگاہی کے ساتھ کیسے قابل جمع ہے؟

کیا یہ روایت تاریخی اور روائی لحاظ سے صحیح اور قابل اعتبار ہے کہ امام علیؑ کو جب تولد کے بعد پیغمبر اکرم (ص) نے اپنی آغوش میں لے لیا، تو علیؑ نے زبان کھولی اور پیغمبر اکرم (ص) سے مخاطب ہو کر کہا: کیا آپ کے لئے تورات یا انجیل سے کچھ پڑھوں؟ اس کے بعد سورہ مومنون کی کچھ آیات کی تلاوت فرمائی؟ کیا یہ واقعہ پیغمبر (ص) کی رسالت اور آپ (ص) کی رسالت سے قبل قرآن مجید کے محتویٰ سے عدم آگاہی اور امام علیؑ کا قرآن مجید اور دوسری آسمانی کتابوں پر عبور رکھنا قابل جمع ہے؟

مختصر جواب

یہ روایت بعض احادیث کی کتابوں میں آئی ہے۔ لیکن اس میں نہیں کہا گیا ہے کہ امام علیؑ نے یہ بات کی ہو کہ: اے پیغمبر (ص) ؛ کیا آپ کے لئے تورات اور انجیل سے پڑھوں ۔۔۔؟ بلکہ انہوں نے سلام کے بعد رسول خدا (ص) کے لئے سورہ مومنون کی چند آیتوں کی تلاوت فرمائی۔ سورہ مومنون کی چند آیتوں کی تلاوت کرنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی رسالت سے کسی قسم کی منافات نہیں ہے، اوراس سے رسالت سے پہلے رسول اللہﷺ کی قرآن مجید کے محتویٰ سے عدم آ گاہی ثابت نہیں ہوتی ہے کیونکہ قرآن مجید ایک ایسی حقیقت کا حامل ہے جو اس کے پہلے مرتبہ پر عالم نور میں پیغمبر اکرم (ص) پر نازل ہوا تھا۔ اسی طرح بعض روایتوں میں، قرآن مجید کے الحقائق الانبیاء والے مرتبہ کے بارے میں اشارہ ہوا ہے، جو اس کے ظاہری الفاظ کے ماورا تھا اور یہ ایک ایسی چیز نہیں ہے، جو صرف ظہور اسلام کے بعد والے زمانہ سے مخصوص ہو، بلکہ قرآن مجید، تمام انبیاء کے کلام کی حقیقت ہے اور انبیاءؑ میں سے ہر ایک نبی اسی حقیقت کے ایک مرتبہ سے متصل تھا۔

اسی لئے، امام علیؑ نے تولد کے بعد آغوش پیغمبر (ص) میں قرآن مجید کی بعض آیات کی تلاوت کی ہے جن میں مومنین کی نجات کے کلی معنی ہیں اور یہ ایک ایسی بات تھی، جو پیغمبر اکرم (ص) کے لئے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔

جس طرح حضرت عیسیٰؑ نے تولد کے بعد فرمایا: میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے۔ جبکہ اس وقت حضرت عیسیٰؑ کے ہاتھ میں کوئی کتاب نہیں تھی، پس اس دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے عالم نور میں حضرت عیسیٰؑ کے نور پر کتاب الٰہی نازل ہوئی تھی۔

تفصیلی جواب

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے چند نکات پر توجہ کرنا ضروری ہے:

(ا) یہ روایت احادیث کی کتابوں میں آئی ہے۔ لیکن اس میں نہیں کہا گیا ہے کہ حضرت علیؑ نے اس قسم کا کلام کیا ہوگا کہ: اے پیغمبر! کیا آپؐ چاہتے ہیں کہ آپؐ کے لئے تورات و انجیل سے کچھ پڑھوں؟ بلکہ آپؑ نے رسول خدا (ص) پر سلام بھیجنے کے بعد سورہ مومنون کی چند آیات کی تلاوت فرمائی[1]۔

(۲) اس روایت کی سند کی تحقیق کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ روایت کی سند کے سلسلہ میں موجود بعض راویوں کی توثیق نہیں کی گئی ہے یا ان کے مدح وذم میں اختلاف پایا جاتا ہے، لیکن روایت کے متن اور محتویٰ کو دوسرے مبانی کے مطابق قبول کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ:

ا۔ امام معصومؑ انسان کامل کا مکمل مصداق ہوتا ہے اور قرآن وقرآن ناطق کو تجسم بخشنے والا ہوتا ہے، اور مسلمانوں کے ہاتھوں میں موجود خطی اور مطبوعہ قرآن مجید، قرآن صامت ہے[2]۔

۲۔نزول قرآن، جو دوسری آسمانی کتابوں کو مکمل کرنے والا ہے، چند مراتب پر مشتمل تھا کہ اس کا پہلا مرتبہ عالم نور میں پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ اطہارؑ کے انوار پر نازل ہوا تھا۔ جیسا کہ یہ آیہ شریفہ: اور آپ کو یہ قرآن خدائے علیم وحکیم کی طرف سے عطا کیا جا رہا ہے۔[3] اسی معنی کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے قرآن مجید کی حقیقت کو ملک کے واسطہ کے بغیر عالم نور میں حاصل کیا ہے اور اس کے بعد ائمہ اطہارؑ کے انوار پر نازل ہوا ہے۔[4]

حتی کہ، بعض روایتوں میں نزول قرآن کے الحقائق الانبیاء نامی مرتبہ کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے، جو اس کے ظاہری الفاظ کے ماورا ایک امر تھا اور یہ ایک ایسی چیز نہیں ہے جو ظہور اسلام کے بعد سے مخصوص ہو، بلکہ قرآن مجید تمام انبیاء کے کلام کی حقیقت ہے اور انبیاءؑ میں سے ہر نبی اس حقیقت کے ایک خاص مرتبہ سے متصل تھا[5]۔ اگرچہ اس کی عالی اور مکمل حقیقت پیغمبر اکرم (ص) کے قلب مبارک پر نازل ہوئی ہے۔

مذکورہ نکات کے پیش نظر:

الف۔ یہ روایت، پیغمبر اکرم (ص) کی رسالت کے منافی نہیں ہے اور اس سے رسالت سے پہلے پیغمبر (ص) کے قرآن مجید کے محتویٰ سے عدم آگاہی کا نتیجہ نہیں نکلتا ہے، کیونکہ قرآن مجید کے نزول کے کئی مراتب ہیں اور اس کا پہلا مرتبہ نبی اکرم (ص) کے نور

مقدس پر نازل ہونا تھا اور آنحضرت (ص) کی ایک ایسی حقیقت ہے جو آپ (ص) کے اس مادی دنیا کے ظاہری بدن کے علاوہ ہے، جس طرح حضر گئےت عیسیٰؑ نے تولد کے بعد فرمایا: میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے[6]۔ جبکہ اس وقت حضرت عیسیٰؑ کے ہاتھ میں کوئی کتاب نہیں تھی، پس اس دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے عالم نور میں حضرت عیسیٰؑ کے نور پر کتاب الٰہی نازل ہوئی تھی۔

ب۔ عالم نور میں، قرآن مجید کی نورانی حقیقت امام علیؑ کے باطن پر بھی نازل ہوئی تھی۔ اسی لئے امام علیؑ نے تولد کے بعد آغوش پیغمبر (ص) میں قرآن مجید کی چند آیات کی تلاوت فرمائی اور یہ بات پیغمبر (ص) کے لئے کوئی نئی چیز نہیں تھی، کیونکہ پیغمبر اکرم (ص) قرآن مجید کے عین علم اور تمام عالم اور قرآن مجید کے علم سے آگاہ تھے۔

حواشی

[1]. شیخ طوسی، امالی، ص 708، انتشارات دار الثقافۃ، قم، 1414 ق؛ مجلسی، محمد باقر، بحارالانوار، ج 35، ص 18، مؤسسۃ الوفاء، بیروت، 1404 ھ.

[2]. ملاحظہ ہو: عناوین "فضیلت و برتری ائمہ نسبت بہ قرآن"، سؤال 10232 (سایت: 10152)؛ "برتری پیامبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بر قرآن"، سؤال 13557 (سایٹ: ur13280).

[3]. "وَإِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْآنَ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ عَلِيمٍ ۝"، نمل، 6.

[4]. ملاحظہ ہو: طیب، سید عبد الحسین، اطیب البیان فی تفسیر القرآن، ج 9، ص 107 و 354 و ج 10، ص 285 و 286، انتشارات اسلام، تہران، چاپ دوم، 1378 ھ ش.

[5] ملاحظہ ہو: عناوین "مراتب و حقائق قرآن، سؤال 10688 (سایٹ: 12360)؛ "مراتب نزول قرآن و جایگاہ الفاظ در وحی الاہی"، سؤال 12318 (سایٹ: ur12107)؛ "نزول قرآن"، سؤال 2277 (سایٹ: ur2420).

[6]. مریم، 30.

قرآن کریم کے کتنے سوروں کے نام انبیائے الٰہی کے نام پر ہیں؟

جواب

چھ سورے قرآن کریم میں پیغمبروں کے نام پر آئے ہیں: نوح، ابراہیمؑ، یونس، یوسف، ھود اور محمد۔

البتہ مفسّرین روایات کی روشنی میں معتقد ہیں کہ قرآن کے بعض سورے مثلاً: طہٰ [1] یس؛ [2] مدثر [3] اور مزّمل [4] سے مراد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے لہٰذا یہ سورے بھی ایک طرح سے ان سوروں میں ہیں جو انبیائے الٰہی کے ناموں پر ہیں۔

حواشی

[1] مکارم شیرازی؛ ناصر؛ تفسیر نمونہ؛ ج ۱۲ ص ۱۵۷؛ دار الکتاب الاسلامیہ تھران؛ ۱۳۷۴ ش

[2] ہمان؛ ج ۱۸؛ ص ۳۱۵

[3] حسینی ہمدانی؛ محمد حسین؛ انوار درخشان؛ ج ۱۷ ص ۱۷۴ لطفی؛ تھران؛ ۱۴۰۴ ق؛

[4] ایضاً، ج ۱۷، ص ۱۴۹

اب تک کس نے شیطان سے مقابلہ میں کامیابی حاصل کی اور کس طرح؟

شیاطین اور ان کا جنوں کا لشکر اکثر مومن انسانوں پر حملہ کرتا ہے تا کہ انہیں خدا سے دور کافر اور شرک کر دیں اب تک کون اسکے مقابلہ میں ڈٹا رہا اور کس طرح اس سے مقابلہ کیا ہے

مختصر جواب

قرآن کے مطابق شیطان صرف خدا کے مخلص بندوں پر مسلط نہیں ہوتا۔ مخلص وہ لوگ ہیں جو اس درجہ پر پہنچے ہوئے ہیں کہ شیطان انہیں گمراہ نہیں کر سکتا شیطان سے مقابلہ کی بعض راہیں اور ضروری وسائل ہیں کہ ان کے ذریعے اس پر قابو پایا جاتا ہے نمونہ کے طور ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔

1۔ ایمان: قرآن کریم کو شیطان کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ جانتا ہے۔

۲ توکل: شیطان اور اس کے لشکر پر قابو پانے کا دوسرا وسیلہ اللہ کی ذات پر توکل ہے

۳ استفادہ: یعنی خدا سے پناہ کی درخواست

۴۔ خدا کی یاد انسان کو بصیرت دیتی ہے اسے وسوسہ سے بچاتی ہے اور شیطان کی

مداخلت کی راہ کو بند کرتی ہے۔

تقوا: تقوا کا ملکہ پیدا کرنے اور اسے مضبوط کرنے سے دل کی آنکھیں کھلتی ہیں اور انسان، شیطان کے فریب سے محفوظ رہتا ہے

تفصیلی جواب

قرآن کی رو سے صرف خدا کے مخلص بندوں پر شیطان قابو نہیں پاتا قرآن میں ہے کہ شیطان نے قسم کھائی ہے کہ میں تمام بندوں کو گمراہ کروں گا صرف تیرے مخلص بندے میرے قابو میں نہ آئیں گے: (الْمَعْلُومِ ﴿٨١﴾ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٨٢﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ﴿٨٣﴾)[1] شیطان نے کہا، عزت کی قسم میں ان سب کو گمراہ کردوں گا مگر ان میں سے ترے خاص بندوں کو گمراہ نہ کرسکوں گا

یا خداوند عالم فرماتا ہے: (إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ ﴿٤٢﴾) [2] بلا شبہ تو میرے خاص بندوں پر مسلط نہ ہو پائے گا مگر وہ لوگ جو تیری پیروی کریں گے گمراہ ہوں گے۔

ان آیات کے مطابق مخلصین [3] شیطان کے دائرہ سے باہر ہیں اور وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف شیطان نے بھی کیا ہے اور خداوند عالم نے صراحت کی ہے اور فرمایا ہے: (إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ) تو ہرگز میرے خاص بندوں پر قابو نہ پائے گا

شیطان سے مقابلہ کی راہیں

مخلصین وہ لوگ جو اس درجہ کو پہنچے ہوئے ہیں کہ شیطان ان پر قابو نہیں پا سکتا۔ شیطان پر قابو پانے کے لے کچھ وسائل لازم وضروری ہیں جن کے ذریعہ اس سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے اور اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ یہاں ہم نمونہ کے طور پر ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۱۔ قرآن کریم ؛ شیطان پر قابو پانے اور اس کے مسلط ہونے کا پہلا بنیادی وسیلہ ایمان کو جانتا ہے (اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۔۔۔)[4] شیطان ایمان والوں پر مسلط نہیں ہوتا۔

۲۔ شیطان اور اس لشکر پر کامیاب ہونے کا ایک دوسرا ذریعہ توکل خدا پر بھروسہ ہے (اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ۝۹۹)[5] شیطان ان لوگوں پر جو۔۔۔ اور اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں ؛ مسلط نہیں ہوسکتا۔

لہٰذا خدا اور اس کی نشانیوں پر ایمان لانا انسانوں پر شیطانوں کی حاکمیت میں رکاوٹ بنتا ہے اور وہ لوگ جو ایمان کے قلعہ میں رہتے ہیں اور خدا پر توکل کرتے ہیں ان پر شیطان کسی بھی طرح مسلط نہیں ہوگا شیطان ان ہی پر مسلط ہوتا ہے جو شیطان کی حاکمیت قبول کرتے ہیں اور شرک اختیار کرتے ہیں (اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ۝۱۰۰)[6] شیطان ان ہی لوگوں پر غالب آتا ہے جو اسے دوست رکھتے ہیں اور مشرک ہوجاتے ہیں۔

۳۔ استفادہ یعنی خدا کی بارگاہ میں شیطان سے پناہ مانگنا یہ پناہ گاہ کبھی تکوینی ہے کبھی تشریعی۔ طبیعی برائیوں کو دور کرنے کے لئے خدا کی تکوینی پناہ گاہ سے استفادہ کرنا چاہئے ان سے مراد وہ قوانین اور الٰہی سنتوں میں جو نظام خلقت میں طبیعی اسباب وعلل کی صورت میں قائم ہوئے ہیں ؛ اور نفسانی برائیوں سے محفوظ رہنے کے لئے جیسا کہ سورہ ناس میں بھی آیا ہے خدا کی تشریعی پناہ گاہ میں جانا چاہئے یہ پناہ گاہیں الٰہی تعلیمات میں جو اعتقادی بنیادوں کے طور پر شریعت مقدسہ میں تربیتی منصوبوں کی شکل میں مقرر ہوئی ہیں (وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۝۲۰۰)[7] اگر شیطان کی جانب سے تمہیں کوئی وسوسہ ہو تو خدا کی پناہ میں آؤ کیونکہ وہی سننے اور جاننے والا ہے۔

اصولاً توحید کا تقاضا یہ ہے کہ انسان فائدہ اور خیر حاصل کرنے کے لے خدا سے مدد طلب کرے اور اپنے کاموں کو (بسم اللہ) سے شروع کرے، اور برائیاں ونقصان سے بچنے کے لئے بھی خدا سے مدد چاہے اور اپنے کاموں کو (اعوذ باللہ) سے شروع کرے اس لئے کہ توحیدی نقطۂ نظر سے خدا کے علاوہ کوئی چیز عالم میں اثر ڈالنے والی نہیں ہے۔

۴۔ ذکر خدا و یاد خدا انسان کو بصیرت عطا کرتی ہے اسے وسوسہ سے دور رکھتی ہے اور شیطان کے نفوذ کی راہوں کو بند کرتی ہے (۔۔۔ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ۝۲۰۱)[8] امام صادق علیہ السلام بھی فرماتے ہیں: شیطان، انسان پر وسوسہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا مگر اس وقت جب وہ خدا کی یاد سے غافل ہو جائے[9] حضرت امیرالمومنین علیہ السلام ذکر خدا کو شیطان کو دور کرنے کا ذریعہ جانتے ہیں (ذکر الله مطردته الشیطان)[10]۔

۵۔ تقوا میں ملکہ حاصل کرنا اور اسے مضبوط کرنا، دل کی آنکھوں کو کھول دیتا ہے اور وہ شیطانی وسوسوں کو دیکھ لیتی ہیں اور انسان کو شیطان کے جال سے محفوظ رکھتی ہیں (اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ۝۲۰۱)[11]

۱۱۔ پرہیزگار افراد جب شیطانی وسوسہ کا شکار ہوتے ہیں تو خدا کو یاد کرتے ہیں اور (اس کے سبب) اچانک بینا اور اہل بصیرت ہو جاتے ہیں۔

طائف کے معنی میں طواف کرنے والا، گویا شیطانی وسوسے طواف کرنے والے کی طرح انسان کی روح اور اس کی فکر کے گرد برابر چکر لگاتے ہیں تاکہ موقع ملتے ہی داخل ہو سکیں۔ شیطان اس روح پر اثر نہیں کر سکتا جو ایمان اور تقوا کے ذریعہ محکم ہو چکی ہو؛ لیکن برابر موقع کی تلاش میں رہتا ہے اور بعض نفسانی خواہشات مثلاً شہوت، غصہ، حسد اور انتقام وغیرہ کو بھڑکاتا ہے تاکہ موقع پاتے ہی انسان میں نفوذ کرے اور گمراہ کرے۔

شیطان سے مقابلہ کی بعض دوسری راہیں یہ ہیں: اہل بیت علیہم السلام کا ذکر، اہل بیت

علیہم السلام کے دوستوں کے ساتھ احسان، خود کو ان افراد کے ساتھ رکھنا جن پر شیطان کا غلبہ نہیں ہوتا اور۔۔۔۔

نتیجہ: خدا پر اعتقاد انسان کو برائیوں اور گناہوں سے دور رکھنے کا مؤثر ذریعہ ہے نیز خدا کی عزت وحکمت پر توجہ اور خدا کے امور کی طرف رجوع کرنے سے انسان کی روح شیطان سے مقابلہ میں قوی ہوتی ہے۔ ایمان کی تقویت، توکل، تقوا، یاد خدا اور شیطان کو اذیت پہنچانے والے امور نیز شیطان کی طرف سے شر وفساد کی۔۔۔ کے موقع پر استعاذہ اور خدا سے پناہ مانگنا شیطان سے دوری کے مؤثر اقدام تو۔۔۔۔۔۔لیکن یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مذکورہ بالا چیزیں اہل بیت علیہم السلام سے توسل اور انکی عنایت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

حواشی

[1] اسراء۔ ۶۵۔

[2] حجر۔ ۴۲

[3] مخلص وہ شخص ہے جس نے اپنی روح کو طبیعت کی کثافتوں اور مالی امور سے پاک کرلیا ہو۔ قلب کو غیر خدا سے پاکیزہ بنا لیا ہو اور اسے اللہ کی محبت بڑھ لیا ہو۔

[4] نحل۔ ۹۹

[5] ایضاً

[6] ایضاً، ۱۰۰

[7] اعراف۔ ۲۰۰، فصلت۔ ۳۶۔

[8] اعراف۔ ۲۰۱

[9] محدث نوری، مستدرک الوسائل، ج ۱، ص ۱۷۸، موسسہ آل البیت، قم، ۱۴۰۸ ق؛ مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، ج ۲۷، ص ۱۲۴، موسسہ الوفاء، بیروت، ۱۴۰۴ ق۔

[10] آمدی تمیمی، عبدالواحد، غرر الحکم و درر الکلم، ص ۱۸۸، مکتب الاعلام الاسلامی، قم، ۱۳۶۶ ش۔

[11] اعراف۔ ۲۰۱

آیہ شریفہ سَمّٰعُونَ لِلۡكَذِبِ اَكّٰلُونَ لِلسُّحۡتِ کیسے رشوت کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہے؟

مختصر جواب

یہ آیہ شریفہ ان آیات میں سے ہے جومندرجہ ذیل بیان کے پیش نظر رشوت کے حرام ہونے کی دلالت کرتی ہیں:

ا۔لغوی اعتبار سے سحت کے معنی نابود ہونے، تباہ ہونے اورختم ہونے کے ہیں۔ اورحرام مختلف لحاظ سے، جیسے عذاب اور تباہی کو اپنے ساتھ لانے، برکت نہ ہونے، مروت اورغیرت کے فقدان وغیرہ کے اعتبار سے سحت جانا جاتا ہےاوراحادیث کے مطابق رشوت بھی سحت کے ایک مصادیق میں سے ہے، پس سحت کے معنی، مال کوحلال طریقوں سے حاصل نہ کرنے کے ہیں۔

۲۔ اس آیہ شریفہ کی تفسیر میں ائمہ اطہار علیہ السلام سے منقول احادیث کو مدنظر رکھتے ہوئے سحت کے مختلف مصادیق میں اہم مصداق رشوت ہے۔ امام صادق علیہ السلام سے سحت کے بارے میں پوچھا گیا۔تو انہوں نے جواب میں فرمایا: سحت حکم) فیصلہ،قضاوت (کرنے میں رشوت لینے کو کہتے ہیں۔

۳۔ مندرجہ بالا موارد کوملحوظ خاطر رکھتے ہوئے مفسروں اورفقہاء نے رشوت کے

حرام ہونے میں اس آیہ سے استناد کیا ہے۔

تفصیلی جواب

اسلامی فقہ میں، رشوت کے حرام ہونے کو اجمالی طور پر قبول کیا گیا ہے۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ [1] قرآن مجید کی مختلف آیات میں سے ایک ایسی آیہ شریفہ ہے جس سے رشوت کے حرام ہونے کے سلسلہ میں پر مفسرین اور فقہاء نے استناد کیا ہے۔ یہ جھوٹ کے سننے والے اور حرام کے کھانے والے ہیں۔

یہ آیہ شریفہ یہودی علماء کی توصیف میں نازل ہوئی ہے جن کی ایک خصوصیت رشوت خوری تھی، سحت سے مراد رشوت ہے۔ یہودی علماء لوگوں سے رشوت لے کر خدا کے حکم کو بدل دیتے تھے[2]

سُحت کا لفظ (سین پر ضمہ کے ساتھ) سحت (سین پر فتحہ) سے لیا گیا ہے جو ختم ہونے، تباہ ہونے کے معنی میں استعمال ہوا ہے[3] اور حرام، عذاب اور نابودی کو اپنے ساتھ لانے اور برکت نہ رکھنے اور مروت اور غیرت کو سلب کرنے کے لحاظ سے سحت جانا جاتا [4] ہے۔ پس سحت کے معنی یوں ہیں کہ ہر وہ چیز جس کا کمانا حلال نہیں ہے[5] یعنی وہ حرام ہے۔

اس آیہ شریفہ کے ذیل میں ائمہ اطہارؑ سے منقول روایات میں سحت کے مختلف معانی کو مدنظر رکھا گیا ہے[6] کہ جس کا اہم مصداق رشوت ہے۔

حضرت امام صادق (ع) سے سحت کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب میں فرمایا: سحت حکم صادر کرنے میں رشوت لینے کے معنی میں ہے[7] ایک اور حدیث میں حکم صادر کرنے میں رشوت لینا، خداوند متعال کے انکار کرنے کے برابر ہے۔[8]

کیونکہ حکم صادر کرنے میں رشوت لینے میں بہت سے مفاسد موجود ہیں اور جو بھی

رشوت حق کو ضائع کرنے اور باطل کو حق جاننے کے لئے لی جائے وہ مفاسد، جیسے جھوٹ بولنا، جھوٹی گواہی دینا، اور مستحقوں سے مال لے کر اسے غیر مستحق کو دینا، جھوٹی گواہی کو سننا اور بے غیرتی وغیرہ کو مشتمل ہے اور چونکہ یہ مفاسد اور برے کام رشوت میں موجود ہیں اس لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار ؑ نے رشوت کو سحت کا سب سے اہم مصداق قرار دیا ہے۔[9]

یہ واضح ہے کہ مذکورہ آیہ شریفہ سحت کی حرمت اور اس کے ذریعے کاروبار کرنے کی حرمت پر دلالت کرتی ہے[10] اس کے علاوہ رشوت کا حرام ہونا جو **سحت** کے اہم مصادیق میں سے ہے اس آیہ شریفہ کی رو سے ہے۔

مفسروں نے اس آیہ کی تفسیر میں **سحت** کے معنی رشوت لئے ہیں نمونہ کے طور پر علامہ طباطبائی نے اس آیہ شریفہ کے ذیل میں **سحت** کے معنی پر بحث کی ہے اور لکھا ہے **اکالون للسحت** یعنی دین کو تباہ کرنے والی چیزوں کو کھاتے ہیں اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو گوشت **سحت** اور حرام سے بن جائے وہ جہنم کی ہے اور رشوت کا نام بھی **سحت** رکھا گیا ہے پس جو بھی مال حرام طریقے سے حاصل ہوجائے، وہ **سحت** ہے اور آیہ کا سیاق یہ سمجھاتا ہے کہ **سحت** وہی رشوت ہے۔[11]

جس اہم نکتے کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اگر رشوت دینے والا ایک باطل مقصد رکھتا ہے تو اس نے حرام کام کیا اور اگر ایک حق کو زندہ کرنے کے لئے رشوت دیتا ہے اور وہ حق صرف رشوت دینے کے ذریعے ہی حاصل ہوتا ہے تو اس نے حرام کام انجام نہیں دیا ہے۔لیکن رشوت لینے والے نے حرام کام انجام دیا ہے چاہے وہ حق پر حکم کرے یا باطل پر رشوت دینے والے کے حق میں حکم دے یا اس کے خلاف۔[12]

حواشی

[1] مائدہ، 42.

[2] طباطبایی، سید محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، ج 5،ص 341، دفتر انتشارات اسلامی،قم،طبع پنجم، 1417ھ.

[3] قرشی، سید علی اکبر، قاموس قرآن، ج 3، ص 237، دار الکتب الاسلامیۃ، تہران، طبع ششم، 1371ش؛ مہیار، رضا، فرہنگ ابجدی فارسی ۔ عربی،ص 72، بی جا و بی تا؛ جزری، ابن اثیر، مبارک بن محمد، النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر، ج 2،ص 345، مؤسسہ مطبوعاتی اسماعیلیان،قم،طبع اول، بی تا.

[4] طریحی، فخر الدین، مجمع البحرین، ج 2،ص 204، تحقیق: سید احمد حسینی، کتابفروشی مرتضوی، تہران، طبع سوم، 1375ش؛ ابن منظور، محمد A بن مکرم، لسان العرب، ج 2،ص 41، نشر دار صادر، بیروت، طبع سوم، 1414ھ.

[5]. مجمع البحرین، ج 2،ص 204؛ لسان العرب، ج 2،ص 41؛ حلّی، مقداد بن عبد اللہ سیوری، کنز العرفان فی فقہ القرآن، ج 2،ص 12،قم،طبع اول، بی تا.

[6] پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ان موارد کو سحت کے مصادیق میں سے جانا گیا ہے، مردار کی قیمت، کتا، شراب، زنا کار عورت کا مہریہ، حکم صادر کرنے میں رشوت، کاھن کی اجرت (شیخ صدوق، من لایحضرہ الفقیہ، ج 4،ص 363، انتشارات جامعہ مدرسین،قم، 1413ھ).

[7] عَنْ أَبِي عَبْدِ اللهِ علیہ السلام : قَالَ: سَأَلْتُهُ عَنِ السُّحْتِ فَقَالَ: الرِّشَا فِي الْحُكْمِ (کلینی، محمد بن یعقوب، الکافی، ج 5،ص 127، دار الکتب الاسلامیۃ، تہران، 1365ھ ـ ش).

[8] الکافی، ج 5،ص 127.

[9] کنز العرفان فی فقہ القرآن، ج 2،ص 12.

[10] کاظمی، فاضل، جواد بن سعد اسدی، مسالک الافہام الی آیات الاحکام، ج 3،ص 9، بی جا و بی تا.

[11] المیزان فی تفسیر القرآن، ج 5،ص 341.

[12] کنز العرفان فی فقہ القرآن، ج 2،ص 13

قرآن مجید کے نظریہ کے مطابق خودآ گاہی کے معنی کیا ہیں؟

مختصر جواب

قرآن مجید کے مطابق، خودآ گاہی کے معنی یہ ہیں کہ انسان، اپنی فطرت اور باطن میں موجود استعدادوں کی پرورش کرے اور زندہ کر کے اپنی حقیقت کو دوبارہ پائے اور اس کے بعد ہستی اور اسماء وصفات الٰہی کا قلباً ادراک کرے۔

خود آ گاہی کے مختلف مراتب اور درجے ہیں، جیسے: فطری خودآ گاہی، عالمی خودآ گاہی اور عرفانی خودآ گاہی اور ان میں سے مکمل مرتبہ عرفانی خودآ گاہی ہے، اور یہ خودآ گاہی، انسان، یعنی خلیفہ الٰہی، کا حقیقت و اصلیت کے ساتھ پیوند ہے۔

تفصیلی جواب

قرآن مجید کے مطابق، خودآ گاہی کے معنی یہ ہیں کہ انسان، اپنی فطرت اور باطن میں موجود استعدادوں کی پرورش کرے اور زندہ کر کے اپنی حقیقت کو دوبارہ پائے اور اس کے بعد ہستی اور اسماء وصفات الٰہی کا قلباً ادراک کرے۔ پس انسان کی ذات اور ذاتی جوہر، خود کو دوبارہ پانا اور خودآ گاہی حاصل کرنا ہے[1]، اور فطری طور پر انسان اس کے ساتھ عشق و محبت کرتا ہے۔

اس لحاظ سے، خودآ گاہی کے مختلف مراتب اور درجے ہیں [2] اور اس کا مکمل مرتبہ عرفانی خودآ گاہی ہے، اور یہ خودآ گاہی، انسان، یعنی خلیفہ الٰہی کا حقیقت و اصلیت کے ساتھ پیوند ہے۔

ہم اس مقالہ میں خودآ گاہی کے مختلف مراتب پر اجمالی طور پر روشنی ڈالیں گے:

ا۔ فطری خودآ گاہی

یہ آ گاہی، فکر وغور کی قسم اور حصولی علم نہیں ہے [3]، بلکہ ایک بیداری اور حضوری علم ہے۔ حضوری خودآ گاہی، یعنی میں ہوں اور اپنی باطنی استعدادوں کے ذریعہ اس ہستی کی آ گاہی رکھتا ہوں۔ یہ خودآ گاہی، اصلی اور حقیقی ہے اور انسان کی عین شخصیت ہے۔ اس خودآ گاہی میں، انسان میں نام کی ایک حقیقت کو پاتا ہے، جو اس کی شخصیت کی عین آ گاہی ہے [4]۔

البتہ، اس مظہر میں، عام طور پر بلاواسطہ اور براہ راست میں پر تسلط نہیں جمایا جا سکتا ہے، بلکہ پہلے انسان کی باطنی طاقت اور فعالیتوں کا ادراک ہوتا ہے، پھر حضوری خودآ گاہی کے لئے میں کا ادراک ہوتا ہے [5]۔

قرآن مجید، رحم میں جنین کی خلقت کے مراحل کے بارے میں اشارہ کرتے ہوئے، اس کے آخری مرحلہ کے عنوان سے، جو حقیقت میں انسان کی خلقت کا سب سے اہم مرحلہ ہے [6]، ارشاد فرماتا ہے: ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقاً آخَرَ [7] (پھر ہم نے اسے ایک دوسری مخلوق بنا دیا)، اسی کی طرف اشارہ ہے کہ مادہ خودبخود خودآ گاہی روحانی جوہر میں تبدیل ہوتا ہے [8]۔ بہ الفاظ دیگر اسے صاحب حیات و قدرت وعلم بنا دیا اور اسے ذاتی

جو ہر عطا کیا، جسے میں کہتے ہیں [9]۔

۲۔ عالمی خودآ گاہی

عالمی خودآ گاہی، یعنی عالم کی بہ نسبت اپنے بارے میں آ گاہی کہ: میں کہاں سے آیا ہوں؟ کہاں پر ہوں؟ کہاں جا رہا ہوں؟ اور اس خودآ گاہی میں انسان انکشاف کرتا ہے کہ وہ عالم نام کے ایک کل کا جزء ہے، وہ جانتا ہے کہ آزاد نہیں ہے بلکہ وابستہ ہے، یعنی، خود نہیں آیا ہے، خود زندگی نہیں گزارتا ہے، اور اس دنیا سے خود نہیں جا رہا ہے، وہ اس کل میں اپنی حالت کو مشخص کرنا چاہتا ہے[10]۔ امام علیؑ نے اپنے بامعنی کلام میں اس قسم کی خودآ گاہی کے بارے میں فرمایا ہے: خدا اس پر رحمت کرے، جو جانتا ہے کہ وہ کہاں سے آیا ہے؟ کہاں پر ہے؟ اور کہاں جا رہا ہے؟[11]

قرآن مجید میں انسان کے مبدا ومعاد کے بارے میں بکثرت آیات موجود ہیں، جو انسان کو دنیا وآخرت کی زندگی کی حقیقت کے بارے میں بیداری وآ گاہی حاصل کرنے کی دعوت دیتی ہیں:

ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور اسی کی بارگاہ میں واپس جانے والے ہیں۔[12]

وہ خدا، وہ ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے پھر ایک مدت کا فیصلہ کیا ہے (تا کہ انسان کمال حاصل کرے) اور مقررہ مدت اس کے پاس اور بھی ہے (جس سے صرف وہی آگاہ ہے)۔[13]

اللہ ہی وہ ہے جس نے تم سب کو خلق کیا ہے پھر روزی دی ہے پھر موت دیتا ہے پھر زندہ کرتا ہے۔۔۔[14]

۳۔عرفانی خودآ گاہی

عرفانی یا عارفانہ خودآ گاہی، خداوندمتعال کے ساتھ رابطہ کے سلسلہ میں اپنے بارے میں آ گاہی ہے۔ یہ رابطہ، دو ایسے موجود کے درمیان نہیں ہے جو ایک دوسرے کے متوازی قرار پائے ہیں۔ بلکہ فرع کے اصل سے رابطہ کی قسم ہے، جائز کے واحد حقیقت (حق تعالیٰ) سے اور مقید کے مطلق سے رابطہ کی قسم ہے، عارف کی کسک ایک اندرونی کسک ہوتی ہے اورفطری ضرورت سے پیدا ہوتی ہے[15]۔

عارف کی نظر میں، روح و جان، حقیقی میں نہیں ہوتے ہیں اور ان کے بارے میں آ گاہی، خود آ گاہی نہیں ہے بلکہ روح و جان، خود اور میں کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہوتا ہے اور حقیقی میں خداوندمتعال ہے۔ اگر انسان خود سے فانی ہو جائے اور تعینات کو توڑ پھوڑ کے انہیں مدنظر نہ رکھے تو روح و جان کا وجود باقی نہیں رہتا ہے اور اس طرح انسان حقیقی خودآ گاہی کی منزل تک پہنچتا ہے[16]۔

اگر انسان، اپنی فطری اور عالمی خودآ گاہی کو پرورش بخشے اور اپنی اصلیت (خلیفہ الٰہی ہونے) سے آ گاہ ہو جائے، تو اس نے اس عارفانہ خودآ گاہی کے میدان میں قدم رکھا ہے اور اس عارفانہ رابطہ کا ادراک کیا ہے اور خدا کی طرف سے اس کے لئے عشق و محبت اور اپنی طرف سے خدا کے عشق و محبت کو دل میں محسوس کرتا ہے: یُحِبّہم و یحبّونہ[17] عارفانہ خودآ گاہی، فطری اور عالمی خودآ گاہی کی پرورش یافتہ ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں خداوندمتعال کے ارشاد کے مطابق، جو چیز خودآ گاہی کے منافی اور اس کے لئے رکاوٹ ہے، وہ خودفراموشی ہے، جو خدا فراموشی کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے: اور خبردار ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا، جنہوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے خود ان کے نفس کو بھی

بھلا دیا اور وہ سب واقعی فاسق اور بدکار ہیں۔[18]

کیونکہ جب انسان خدا کو فراموش کرتا ہے، تو وہ خداوندمتعال کے اسمائے حسنیٰ اور عالی صفات کو بھی فراموش کرتا ہے، جن کے ساتھ اس کا براہ راست رابطہ ہوتا ہے۔ اگر انسان اپنی خودآگاہی کی کوشش وتلاش میں نہ ہو اور اسے اپنے اندر زندہ نہ کرے، تو اس نے خدا کو بُھلا ڈالا ہے اور وہ ہر گناہ کا مرتکب ہو کر عبودیت و بندگی سے خارج ہوتا ہے[19]۔

حواشی

[1]. مطہری، مرتضی، مجموعہ آثار، ج2، ص304 و308، انتشارات صدرا.

[2]. ملاحظہ ہو: مجموعہ آثار، ج2، ص308۔326.

[3]. اس کے برخلاف جب ماہر نفسیات خودآگاہی کی بحث کرتے ہیں، علم حصول اور ذہن کے طریقے سے اپنے بارے میں آگاہی کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔(مجموعہ آثار، ج2، ص309).

[4]. مجموعہ آثار، ج2، ص308،

[5]. ملاحظہ ہو: جعفری، محمد تقی، ترجمہ وتفسیر نہج البلاغہ، ج6، ص262، و ج26، ص61 و62، دفتر نشر فرہنگ اسلامی، تہران، طبع ہفتم، 1376ھ ش.

[6]. مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، ج14، ص208، دارالکتب الاسلامیۃ، تہران، طبع اول، 1374ھ ش.

[7]. مؤمنون، 14.

[8]. مجموعہ آثار، ج2، ص309.

[9]. طباطبایی، سید محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، ج15، ص20، دفتر انتشارات اسلامی، قم، طبع پنجم، 1417ھ.

[10]. مجموعہ آثار، ج2، ص310.

[11]. "رحم اللہ امرأ أعد لنفسہ، واستعد لرمسہ، وعرف من أین وفی أین والی أین" (مغنیۃ، محمد جواد، فی ظلال نہج البلاغہ، ج1، ص22، دارالعلم للملایین، بیروت، طبع سوم، 1358ش؛ نقوی قاینی خراسانی، سید محمد تقی،

مفتاح السعادة فی شرح نہج البلاغہ، ج 5، ص 128، مکتبۃ المصطفوی، تہران، بی تاریخ).

[12]. بقرہ، 156.

[13]. انعام، 2.

[14]. روم، 40.

[15]. مجموعہ آثار، ج 2، ص 319 و 320.

[16]. مجموعہ آثار، ج 2، ص 321.

[17]. مائدہ، 54.

[18]. حشر، 19.

[19]. ملاحظہ ہو: المیزان فی تفسیر القرآن، ج 19، ص 219 و 220.

قرآن مجید کی تفسیر فرات میں سورہ تین کی تفسیر میں ایک حدیث نقل کی گئی ہے، جس کے مطابق "تین" سے مراد امام حسنؑ اور "زیتون" سے مراد امام حسینؑ ہیں۔ کیا اصولی طور پر یہ حدیث اور اس کے مانند حدیثیں قابل اعتبار ہیں؟

جواب

قرآن مجید کے ظاہری معنی کے علاوہ ممکن ہے اس کے بہت سے باطنی معنی بھی ہوں۔ مثال کے طور پر سورہ تین کی پہلی اور دوسری آیت میں خداوندمتعال نے تین و زیتون کی قسم کھائی ہے، ان کے ظاہری معنی وہی انجیر اور زیتون ہو سکتے ہیں، جن کو سب لوگ جانتے ہیں، یعنی انجیر اور زیتون کے میوے جو انجیر اور زیتون کے درخت کی پیداوار ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کے باطنی معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ان میں سے ایک وہی معنی ہیں، جن کے بارے میں سوال میں اشارہ کی گئی حدیث میں بیان کیا گیا ہے، یعنی امام حسن اور امام حسینؑ جو درخت ولایت کے میوے ہیں [1]۔

اسی طرح ان کے دوسرے معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں، چنانچہ ایک روایت میں آیا ہے کہ تین سے مراد مدینۃ الرسول اور زیتون سے مراد مسلمانوں کا قبلہ اول بیت المقدس ہے[2]۔

اس کے علاوہ تفسیر قمی میں آیا ہے کہ انجیر، رسول خدا(ص) اور زیتون امیر المومنین، طور سینین، حسن و حسینؑ اور ہذا البلد الامین سے مراد ائمہ اطہارؑ ہیں[3]۔

اس بنا پر جو حدیث تفسیر فرات میں نقل کی گئی ہے، وہ ان ہی مذکورہ احادیث میں سے ایک ہے جو مثال کے طور پر بیان کی گئیں۔

حواشی

[1]. مجلسی، محمد باقر، بحارالانوار، ج 24، ص 105، مؤسسة الوفاء، بیروت، 1409ق، عَنِ ابْنِ دَرَّاجٍ قَالَ سَمِعْتُ أَبَا عَبْدِ اللهِ عليه السلام يَقُولُ قَوْلُهُ تَعَالَى وَ التِّينِ وَ الزَّيْتُونِ التِّينُ الْحَسَنُ وَ الزَّيْتُونُ الْحُسَيْنُ صَلَوَاتُ اللهِ عَلَيْهِمَا.

[2]. حر عاملی، وسائل الشيعة، ج 14، ص 361، ح 19389، مؤسسه آل البيت عليهم السلام، قم، 1409 ق. عَنْ أَبِي الْحَسَنِ مُوسَى بْنِ جَعْفَرٍ عليه السلام عَنْ آبَائِهِ عليهم السلام قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وآله وسلم إِنَّ اللهَ اخْتَارَ مِنَ الْبُلْدَانِ أَرْبَعَةً فَقَالَ عَزَّ وَ جَلَّ وَ التِّينِ وَ الزَّيْتُونِ وَ طُورِ سِينِينَ وَ هٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ التِّينُ الْمَدِينَةُ وَ الزَّيْتُونُ بَيْتُ الْمَقْدِسِ وَ طُورُ سِينِينَ الْكُوفَةُ وَ هَذَا الْبَلَدُ الْأَمِينُ مَكَّةُ.

[3] قمی، علی بن ابراهيم عليه السلام، تفسير القمی، ج 2، ص 429، دار الكتب، قم، 1367ھ ش، وَ التِّينِ وَ الزَّيْتُونِ وَ طُورِ سِينِينَ وَ هٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ، قَالَ التِّينِ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وآله وسلم وَ الزَّيْتُونِ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ عليه السلام وَ طُورِ سِينِينَ الْحَسَنُ وَ الْحُسَيْنُ وَ هٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ الْأَئِمَّةُ عليهم السلام

قرآن مجید میں بروج سے کیا مراد ہے؟

مختصر جواب

قرآن مجید کی جن آیات میں لفظ بروج آیا ہے، ان آیات کے بظاہر معنی یہ ہیں کہ خداوندمتعال فرماتا ہے: اور ہم نے آسمان (زمین کے اوپر والی جہت) میں بروج اور قصر (کہ وہ سورج اور چاند ہیں) بنائے اور انہیں دیکھنے والوں کے لئے ستاروں سے آراستہ کردیا۔

یہ لفظ بھی اپنے قدیمی معنی، کہ وہی برج اور مستحکم ومحصور قلعے ہیں، میں استعمال ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں اس کو استعمال کیا گیا ہے، اور آج کل کے فلک بوس برجوں پر بھی اطلاق ہوتا ہے، جو پوری دنیا میں خاص زینت کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔

تفصیلی جواب

لفظ بروج، برج کی جمع ہے اس کے معنی وہ بلند ٹاور ہیں، جو قلعوں کے چار کونوں پر تعمیر کیے جاتے ہیں تا کہ ان ٹاوروں سے دشمن کے ساتھ مقابلہ کیا جا سکے اور اسے بھگا دیں۔ اس لفظ کے اصلی معنی ظہور ہے اور التبرج بالزینۃ یعنی اظہار زینت ہے[1]۔ اس طرح اس کے معنی ہر وہ چیز ہے جو معلوم و ظاہر ہو۔ اگر اسے زیادہ تر خوبصورت محلوں میں استعمال کیا جاتا ہے، تو یہ اس لئے ہے کہ محل، دیکھنے والوں کے لئے نمایاں اور ظاہر ہوتے ہیں[2]۔ اور آیہ شریفہ سے بھی یہی معنی مراد ہے کہ ارشاد ہوتا ہے: **وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوجًا**

وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿١٦﴾...[3]

آیہ شریفہ **والسماء ذات البروج** میں آسمان کی قسم کھائی گئی ہے جو برجوں (سورج اور چاند)[4] میں محفوظ کیا جاتا ہے[5]۔

اس بنا پر، جن آیات میں بروج آیا ہے کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ: ہم نے آسمان (زمین کے اوپر والی جہت) میں بروج اور قصر (کہ وہی سورج اور چاند کے مقام ہیں) بنائے اور انہیں دیکھنے والوں کے لئے ستاروں سے آراستہ کردیا۔[6] البتہ بعض مفسرین نے بروج کے وہی علم نجوم کے سال کے بارہ اصطلاحی برجوں کے معنی لئے ہیں[7]۔

آیہ شریفہ: اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۭ [8] حقیقت میں مثال ہے، اور قرآن مجید ان چیزوں کی مثال پیش کرنا چاہتا ہے کہ انسان ان سے اپنے آپ کو نامناسب حالات اور خطرات سے محفوظ رکھے، اور اس کے یہ معنی ہیں کہ موت ایک ایسا مقدر ہے کہ کوئی اس سے محفوظ نہیں رہ سکتا ہے، اگرچہ اس سے بچنے کے لئے مضبوط ترین پناہ گاہوں میں بھی پناہ لے لے[9]۔

کوئی چیز، حتی کہ مستحکم بروج بھی موت کو نہیں روک سکتے ہیں، اس کی وجہ بھی ظاہر ہے، کیونکہ موت، تصور کے برخلاف، انسان کے باہر سے نفوذ نہیں کرتی ہے، بلکہ عام طور سے اس کا سرچشمہ انسان کے اندر ہوتا ہے، کیونکہ بدن کے مختلف نظام خواہ نخواہ محدود ہوتے ہیں اور ایک دن ختم ہو جاتے ہیں، لیکن غیر طبیعی موتیں انسان کے باہر سے آتی ہیں اور طبیعی موت اندر سے، لہذا، مستحکم برج اور استوار قلعے بھی ان پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے ہیں۔ صحیح ہے کہ مستحکم قلعے کبھی غیر طبیعی موت کو روکتے ہیں، لیکن آخرکار کسی اور دن طبیعی موت سے انسان دوچار ہوتا ہے[10]۔

خلاصہ یہ کہ یہ لفظ بھی اپنے قدیمی معنی، کہ وہی برج اور مستحکم و محصور قلعے ہیں، میں

استعمال ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں اس کو استعمال کیا گیا ہے، اور آج کل کے فلک بوس برجوں پر بھی اطلاق ہوتا ہے، جو پوری دنیا میں خاص زینت کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔

حواشی

[1]. طباطبائی، سید محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، ترجمہ، موسوی، سید محمد باقر، ج 5، ص 6، دفتر انتشارات اسلامی، قم، 1374ھ ش.

[2]. ایضاً، ج 20، ص 413.

[3]. حجر، 16.

[4]. طریحی، فخر الدین، مجمع البحرین، محقق و مصحح: حسینی، سید احمد، ج 2، ص 276، نشر کتابفروشی مرتضوی، تہران، طبع سوم، 1416ھ.

[5]. ترجمہ المیزان فی تفسیر القرآن، ج 20، ص 413.

[6]. طبع، ج 12، ص 202؛ مجمع البحرین، ج 2، ص 276.

[7]. آلوسی، سید محمود، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم، تحقیق: عطیۃ، علی عبدالباری، ج 15، ص 294، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، طبع اول، 1415ھ.

[8] نساء، 78: تم جہاں بھی رہو گے موت تمہیں پا لے گی چاہے مستحکم قلعوں میں کیوں نہ بند ہو جاو۔.

[9] ترجمہ المیزان فی تفسیر القرآن، ج 5، ص 6.

[10] مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، ج 4، ص 19، دار الکتب الاسلامیۃ، تہران، طبع اول، 1374ھ ش.

کلی طور پر سورہ بنی اسرائیل کی تعلیمات کیا ہیں؟

جواب

مشہور مفسرین کے نظریہ کے مطابق، سورہ بنی اسرائیل (اسراء)،[1] مکہ میں نازل ہوا ہے اور مکی سوروں میں سے ہے[2]۔

کلی طور پر، سورہ بنی اسرائیل کی تعلیمات مندرجہ ذیل مسائل کے محوروں پر مشتمل ہیں:

۱۔نبوت کے دلائل، خاص کر قرآن مجید اور پیغمبر اکرم (ص) کی معراج کا معجزہ۔

۲۔معاد، کیفر کردار، پاداش اور نامہ اعمال وغیرہ سے متعلق مسائل۔

۳۔قوم بنی اسرائیل کی داستان سے متعلق تاریخ کا ایک حصہ جو سورہ کی ابتدا اور آخر میں آیا ہے۔

۴۔ارادہ کی آزادی اور اختیار کا مسئلہ اور یہ کہ ہر قسم کے نیک و بد عمل کا نتیجہ خود انسان کی طرف پلٹتا ہے۔

۵۔اس دنیا کی زندگی کے حساب و کتاب کا مسئلہ جو دوسری دنیا کے لئے ایک مثال ہے۔

۶۔تمام سطحوں پر حق شناسی، خاص کر اپنے رشتہ داروں کے بارے میں، اور ان میں بھی علی الخصوص ماں باپ کے بارے میں۔

۷۔ اسراف اور فضول خرچی، بخل، اولاد کشی، زنا، یتیموں کا مال کھانا، کم تولنا، تکبر، اور خوں ریزی کا حرام ہونا۔

۸۔ توحید اور خداشناسی کی بحثیں

۹۔ حق کے مقابلے میں ہر قسم کی ہٹ دھرمی سے مبارزہ اور یہ کہ انسان اور حق کے درمیان گناہ پر پردہ ڈالتا ہے۔

۱۰۔ انسان کی شخصیت اور دوسری مخلوقات پر اس کی برتری۔

۱۱۔ ہر قسم کی اخلاقی اور اجتماعی بیماریوں کا علاج کرنے میں قرآن مجید کا اثر۔

۱۲۔ قرآن مجید کا معجزہ اور اس کا مقابلہ کرنے کی کمزوری۔

۱۳۔ شیطان کے وسوسے اور تمام مومنین کو شیطان کے انسان میں نفوذ کرنے کی راہوں سے ہوشیار رہنے کا انتباہ۔

۱۴۔ اخلاقی تعلیمات

۱۵۔ تمام انسانوں کے لئے درس عبرت اور مذکورہ بالا مسائل کے لئے شاہد کے عنوان سے انبیاءؑ کی تاریخ کی ایک جھلک [3]۔

مختصر یہ کہ سورہ، عقیدتی، اخلاقی اور اجتماعی بحثوں پر مشتمل ہے اور مختلف ابعاد میں انسان کے لئے ارتقا و کمال تک پہنچنے کا ایک مکمل نسخہ ہے [4]۔

حواشی

[1]. اس سورہ کا مشہور نام بنی اسرائیل ہے اور اس کے دوسرے نام اسراء اور سبحان ہیں۔؛ مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، ج 12، ص 3، دار الکتب الاسلامیۃ، تہران، 1374 ھ ش.

[2]. ایضاً، ص 5.

[3]. ایضاً، ص 5 و 6.

[4]. ایضاً، ص 6.

وہ کونسا سورہ ہے، جس کے نزول کے وقت ستر ہزار فرشتوں نے اسے وداع کیا ہے؟

جواب

احادیث کی کتابوں میں درج روایتوں کے مطابق یہ خصوصیت سورہ انعام کے لئے بیان کی گئی ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام اس سلسلہ میں فرماتے ہیں: سورہ انعام کو مکمل طور پر یکدفع نازل کیا گیا ہے، جبکہ ستر ہزار فرشتے اسے وداع کر رہے تھے یہاں تک کہ حضرت محمد (ص) پر نازل کیا گیا۔ لہٰذا اس کی قدر کیجئیے، بیشک اس میں خداوند متعال کا اسم اعظم ستر جگہوں پر ذکر کیا گیا ہے۔ اگر لوگ جانتے کہ اس سورہ میں کونسی حقیقتیں مضمر ہیں، تو اسے نہیں چھوڑتے۔[i]

حواشی

[i] کلینی، محمد بن یعقوب، کافی، ج 2، ص 622، ح 12، دار الکتب الاسلامیۃ، تہران، 1365 ہ ش.

الحمد للہ رب العالمین کے بارے میں امام حسن عسکریؑ کی تفسیر کیا ہے؟

مختصر جواب

امام حسن عسکری علیہ السلام کی تفسیر، حضرتؑ سے منسوب تفسیر ہے کہ بعض علماء کئی وجوہات کی بنا پر اس انتساب کو قطعی اور حتمی نہیں جانتے ہیں۔ اس تفسیر میں، سورہ فاتحہ الکتاب (حمد)، سورہ بقر کی آیت نمبر 282 تک روائی صورت میں تفسیر کی گئی ہے کہ قرآنی علوم کی اصطلاح میں اسے تفسیر ماثور کہتے ہیں۔

بہرحال، امام حسن عسکری علیہ السلام نے الحمد للہ رب العالمین کی تفسیر میں، خدا کی بے شمار نعمتوں کے لحاظ سے اس کی ستائش، مخلوقات کی حمایت اور امام علیؑ کی امامت و ولایت کو قبول کرنے کی وجہ سے شیعوں کی برتری کی طرف اشارہ کیا ہے اور فرمایا ہے کہ ان نعمتوں کے پیش نظر خداوند متعال کی ستائش کرتے ہوئے کہنا چاہئے:

الحمد للہ رب العالمین۔

تفصیلی جواب

امام حسن عسکریؑ کی تفسیر، حضرتؑ سے منسوب تفسیر ہے کہ بعض علماء کئی وجوہات کی بنا پر اس انتساب کو قطعی اور حتمی نہیں جانتے ہیں [1]۔ اس تفسیر میں، سورہ فاتحہ الکتاب (حمد)،

سورہ بقر کی آیت نمبر 282 تک روائی صورت میں تفسیر کی گئی ہے کہ قرآنی علوم کی اصطلاح میں اسے تفسیر ماثور کہتے ہیں [2]۔

بہرحال، آیہ الحمد للہ رب العالمین کے بارے میں امام حسن عسکریؑ کی تفسیر کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

الحمد للہ یعنی، خداوندمتعال نے جو نعمتیں اپنے بندوں کو عطا کی ہیں، ان میں سے بعض کو اجمالی طور پر پہنچوایا ہے، اور یہ اس لحاظ سے ہے کہ خدا کے بندے تفصیلی صورت میں ان سب نعمتوں کو پہچاننے کی طاقت نہیں رکھتے ہیں، کیونکہ اس کی نعمتیں بے شمار ہیں، اس لئے انہیں پہچانا نہیں جا سکتا ہے؛ اس لحاظ سے ان سے فرمایا ہے کہ کہو: الحمدللہ [3]

اس کے بعد حضرتؑ رب العالمین کی تفسیر و توضیح میں حسب ذیل نکات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ پروردگار عالم، اپنی تمام مخلوقات کو رزق عطا کرتا ہے، ان کی حمایت سے رکھوالی کرتا ہے، ان پر مسلط ہے، اپنی مصلحت کی بنیاد پر تدبیر کرتا ہے، اور وہ حقیقت میں اپنے بندوں کے حق میں روف و رحیم ہے [4]۔

۲۔ تمام مخلوقات کا رزق معلوم اور تقسیم شدہ ہے، انسان، دنیا میں جس طریقے اور دین پر عمل کرنا چاہے اور جس حالت میں بھی ہو، اسے رزق ملتا رہتا ہے۔ انسان اور اس کے رزق کے درمیان ایک پردہ اور رکاوٹ ہے، جبکہ رزق اس کا طالب اور ڈھونڈنے والا ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی اپنے رزق کی تلاش و کوشش میں کوتاہی کرے تو خود رزق اس کی تلاش و کوشش کرتا ہے، جس طرح موت، اس کے پیچھے آتی ہے [5]۔

۳۔ شیعوں کو ان کو عطا کی گئی برتری اور فضیلت کے لئے خدا کا شکرگزار رہنا چاہئے [6]۔

اس سلسلہ میں خداوند متعال نے حضرت موسیٰؑ سے مخاطب ہوکر، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دوسرے انبیاءؑ پر برتری اور امت پیغمبرؐ کی دوسرے انبیاءؑ کی امتوں پر برتری کی توصیف کی ہے اور امت محمدی کی طرف مخاطب ہوکر فرماتا ہے:

اے امت محمدؐ؛ یقین جاننا کہ تم پر میری قضا (وقدر)، یوں ہے کہ میری رحمت، غضب سے اور میری عفو وبخشش، میرے عذاب سے آگے ہے؛ پس میں، دعا کرنے سے پہلے تمہاری دعا کو قبول کرتا ہوں اور مجھ سے درخواست کرنے سے پہلے تمہیں عطا کرتا ہوں، اگر تم میں سے کوئی لا الہ الّا اللہ وحدہ لا شریك له و أنّ محمّدا عبدہ و رسوله کی گواہی دے کر میری ملاقات کے لئے آئے اور اپنے گفتار وکردار میں سچا ہو؛ (یعنی جو کچھ کہتا ہے اسے جانتا اور اس پر عمل کرتا ہے) اور گواہی دے کہ علی بن ابیطالبؑ، محمدؐ کے بھائی اور آپؐ کے بعد آپؐ کے وصی و ولی ہیں [7]، تو میں اسے بہشت میں داخل کروں گا۔[8]

۴۔ پس ان تمام نعمتوں کی وجہ سے شکر وثنا بجا لاتے ہوئے کہنا چاہیے: الحمد للہ رب العالمین[9]

حواشی

[1]. اس تفسیر کی سند کی بحث کے بارے میں آگاہی حاصل کرنے کے لئے ملاحظہ ہو: علوی مہر، حسین، آشنائی با تاریخ تفسیر ومفسران، ص 191 ۔ 198، نشر مرکز جهانی علوم اسلامی، قم، طبع اول، 1384ھ ش.

[2]. ملاحظہ ہو: مؤدب، سید رضا، روشهای تفسیر قرآن، ص 167 ۔ 169، نشر اشراق، قم، طبع اول، 1380ھ ش.

[3]. التفسیر المنسوب الی الامام الحسن العسکریؑ، ص 30، نشر مدرسہ امام مہدی (عج)، قم، طبع اول، 1409ھ.

[4]. التفسیر المنسوب الی الامام الحسن العسکری ؑ، ص 30، نشر مدرسہ امام مہدی (عج)، قم، طبع اول، 1409ھ.

[5]. التفسیر المنسوب الی الامام الحسن العسکری ؑ، ص 31، نشر مدرسہ امام مہدی (عج)، قم، طبع اول، 1409ھ.

[6]. التفسیر المنسوب الی الامام الحسن العسکری ؑ، ص 31، نشر مدرسہ امام مہدی (عج)، قم، طبع اول، 1409ھ.

[7]. ضمیر "ولیّه" درعبارت "مَنْ لَقِيَنِي مِنْكُمْ بِشَهَادَةِ... أَنَّ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ أَخُوهُ. وَ وَصِيُّهُ مِنْ بَعْدِهِ وَ وَلِيُّه" میں "مَن" پر کی ضمیر "محمد"؛ کی طرف پلٹتی ہے۔ اس لحاظ سے اس کے معنی یہ ہیں: امام علیؑ اس کے ولی ہیں جس نے انہیں پیغمبرؐ کے بھائی اور وصی ہونے کی گواہی دی ہے۔

[8]. ایضاً، ص 33.

[9]. ایضاً.